

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ سرگودھا کا ترجمان

مدیر
مولانا محمد الیاس گھمن

فقیہ
سرگودھا
ماہنامہ

جلد نمبر 5 فروری 2016 شمارہ نمبر 2

فتاویٰ پر وزائد
حالات کی تبدیلی کا اثر



غزوہ: دنیا کا سب سے بڑا غیر قانونی قید خانہ

قومیوں کا عروج و زوال

محمد نگر ریاست کا دورانیہ

خانقاہی نظام کے خدوخال

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ

www.ahnafmedia.com



مرکز اہل السنۃ والجماعت سرگودھا کا ترجمان

فقیہ
سرگودھا
ماہنامہ

شمارہ نمبر 2

فروری 2016

جلد نمبر 5

معاون مدیر

مولانا
محمد کلیم اللہ حنفی

مدیر

مولانا
محمد الیاس گھمن

خط و کتابت کا پتہ

بیرون ممالک

امریکہ، اسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک
35 ڈالر سالانہ

سعودیہ، انڈیا، متحدہ عرب امارات اور عرب ممالک
25 ڈالر سالانہ

ایران، بنگلہ دیش 20 ڈالر سالانہ

دفتر رسائل و جرائد
مرکز اہل السنۃ والجماعت
87 جنوبی سرگودھا
mag@ahnafmedia.com

آن لائن پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے

www.ahnafmedia.com

قیمت فی شمارہ 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

سالانہ 300 روپے
زیر تعاون

سرکولیشن منیجر

0332-6311808

صبح 4 تا 8 بجے شام



WhatsApp

+923062251253

ناشر
مرکز اہل السنۃ والجماعت سرگودھا

فہرست

4 خانقاہی نظام کے خدوخال

اداریہ

8 فتاویٰ پر زمانہ و حالات کی تبدیلی کا اثر

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

17 قوموں کا عروج و زوال

مولانا ابو الحسن علی ندوی

43 غزہ: دنیا کا سب سے بڑا غیر قانونی قید خانہ

مولانا خورشید عالم داؤد قاسمی

49 برکتہ العصر مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا مجیب الرحمن انقلابی

52 بنوری نسبتوں کا امین

متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھسن

55 عربی خطیہ جمعہ مقامی زبان میں

مولانا محمد نواز الحزینی

دعائیہ اشعار

مانگتا ہوں میں یہ دعا اللہ
 راہ حق پر مجھے چلا اللہ
 تیرا ہر حکم میں بجا لاؤں
 ذکر تیرا کروں سدا اللہ
 جو بھی مانگا عطا کیا تو نے
 راحتِ جاں بھی کر عطا اللہ
 ہر کلی کھل گئی میرے دل کی
 نام جب جب بھی تیرا لیا اللہ
 چھوڑ کر تیرا در کہاں جاؤں
 جب تیرے در کا ہوں گدا اللہ
 کاہے کو ہے مضحل تو اتنا
 ہر مرض کی جب دوا ہے اللہ
 مال و دولت و بال ہے یا رب
 دے مجھے صبر و حوصلہ اللہ
 کل جہاں میں میرا نہیں کوئی
 صرف تو ہی ہے آسرا اللہ
 بخش دے تو میرے گناہوں کو
 ہے امین کی یہ التجا اللہ

خانقاہی نظام کے خدو خال

اداریہ

اہل دل کے دل سے نکلے آہ آہ
بس وہی ہے اختر اصلی خانقاہ

اللہ تعالیٰ نے تلاوت آیات، تزکیہ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مقاصد اور فرائض منصبی قرار دیا ہے۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے فرائض کو باکمال و اتمام ادا فرمایا ہے۔ آپ کے مجملہ فرائض میں سے تزکیہ نفس بھی ہے۔ یعنی امت کے قلوب میں سے غیر اللہ کی محبت اور غیر اللہ کا خوف ختم ہو کر اللہ وحدہ لا شریک کی محبت اور اللہ ذوالجلال کا خوف پیدا ہو ان کے قلب و روح سے بری خصلتیں ختم ہو کر نیک اوصاف اور عمدہ اخلاق پیدا ہوں۔ کیونکہ جب تک دل غیر اللہ اور گندے اوصاف کی آلائشوں سے پاک نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں محبت الہیہ، معرفت خداوندی، رضائے باری عز و جل، اطاعت رسول، عقیدت نبوت اور عمدہ اوصاف و اعلیٰ اخلاق کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتے یہ سارا عمل جہاں ہوتا ہے شریعت کی زبان میں اسے ”خانقاہ“ کہتے ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ قرآن کریم کی سورۃ نور آیت نمبر 36 فی بیوت اذن اللہ۔۔ کے تحت تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں: یہ آیت ذکر اللہ کے لیے بنائی گئی خانقاہوں کی فضیلت اور ذکر و مراقبہ کے جس مقصد کے لیے یہ خانقاہیں بنائی گئی ہیں ان کے پورا کرنے کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اسی آیت کے تحت تفسیر

معارف القرآن میں فرماتے ہیں: روشنی مسجدوں اور خانقاہوں سے ملتی ہے جہاں صبح و شام اللہ کا ذکر ہوتا ہے..... ان گھروں میں اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اس میں تسبیح و تہلیل اور تلاوت قرآن پاک اور دیگر اذکار سب داخل ہیں ان گھروں سے مراد مسجدیں اور خانقاہیں مراد ہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ سیرت المصطفیٰ میں فرماتے ہیں: تحویل قبلہ کے بعد جب مسجد نبوی کا رخ بیت اللہ کی طرف ہو گیا تو قبلہ اول کی طرف دیوار اور اس کے متصل جو جگہ تھی وہ ان فقراء غرباء کے ٹھہرنے کے لیے بدستور چھوڑ دی گئی جن کے لیے کوئی ٹھکانہ اور گھر بار نہ تھا۔ یہ جگہ صفہ کے نام سے مشہور تھی صفہ اصل میں سائبان اور سایہ دار جگہ کو کہتے ہیں وہ ضعیفاء مسلمین فقراء شاکرین جو اپنے فقر پر فقط صابر ہی نہ تھے بلکہ امراء و اغنیاء سے زیادہ شاکر و مسرور تھے جب احادیث قدسیہ اور کلمات نبویہ سننے کی غرض سے بارگاہ نبوت و رسالت میں حاضر ہوتے تو یہاں پڑے رہتے تھے۔ لوگ ان حضرات کو اصحاب صفہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گویا یہ اس بشیر و نذیر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خانقاہ تھی جس نے باہزار رضاء و رغبت فقر کو دنیا کی سلطنت پر ترجیح دی۔

شیخ عبدالمجود تاریخ المدینۃ المنورۃ میں صفہ کے بارے فرماتے ہیں: شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم جن کا طرہ امتیاز الفقر فخری تھا ان کی یہ خانقاہ تھی۔ اور اصحاب صفہ ارباب توکل اور ارباب تبتل کی ایک فاقہ مست جماعت تھی جو تزکیہ نفس، علم و دانش کے حصول کی خاطر فیضان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض بار ہونے کی غرض سے ہر گھڑی خدمت عالیہ نبویہ میں حاضر رہتی تھی۔

سنن دارمی میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی شریف میں

تشریف لائے دیکھا تو وہاں دو الگ الگ حلقے لگے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ لوگ الگ الگ دو حلقوں میں کیوں بیٹھے ہیں۔ ایک ہی حلقے میں کیوں نہیں؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ علم کا حلقہ ہے اور دوسرا ذکر کا حلقہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فی کل خیر۔ یہ دونوں ہی خیر کے حلقے ہیں۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ سیر اعلام النبلاء میں فرماتے ہیں: امام حسن بصری رحمہ اللہ کا ایک خاص حلقہ اپنے گھر میں لگا کرتا تھا اس میں خاص خاص مثلاً عبد الواحد بن زید اور حضرت حبیب عجمی رحمہم اللہ وغیرہ جیسے لوگ شریک ہوتے تھے۔ اس حلقے کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ یتکلمون فیہ فی افات النفوس و طرق علاجہا۔ اس میں نفسانی بیماریوں مثلاً تکبر، حسد، بغض، حرص، لالچ، ریاکاری وغیرہ کی تشخیص اور ان کے دور کرنے کے اسباب و طریقے تجویز کیے جاتے تھے۔

شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: عبد الواحد بن زید اور ان کے احباب نے بصرہ میں سب سے پہلے صوفیاء کرام کیلئے ایک مکان (خانقاہ) تعمیر کیا۔

خواجہ عبید اللہ احرار رحمہ اللہ طبقات صوفیاء میں لکھتے ہیں: دوسری صدی ہجری زمانہ تابعین میں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کے ہم عصر شیخ ابو ہاشم رحمہ اللہ کے لیے ذکر و شغل اور تعلیم و تزکیہ و سلوک کے لیے باقاعدہ خانقاہ کے نام سے مکان کی بنیاد رکھی گئی۔ جیسے انتظامی ضرورت کے تحت تعلیم کتاب و حکمت اور تلاوت آیات کے لیے مدرسہ وجود میں آیا۔ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں جامعہ، دارالعلوم اور مدرسہ وغیرہ کی کوئی خاص اصطلاح مقرر نہیں تھی۔ ایسے ہی تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور اخلاقیات کی عملی تربیت کے لیے خانقاہ وجود میں آئی۔ زمانہ رسالت

میں یہ امور مسجد میں ہوتے تھے کبھی کسی انتظامی ضرورت کے تحت یہی کام مسجد سے علیحدہ مکان میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ مکہ مکرمہ میں یہی عمل غار حرا اور مدینہ طیبہ میں چوتھرہ صفہ پر ہوتا تھا۔ یہ حقیقت میں خانقاہ ہی کے خدوخال تھے جس سے تربیت پا کر صحابہ کرام خدائی امتحان میں سرخرو اور کامیاب ہوئے۔ علم اور ذکر کے حلقے آج کے دور کی پیداوار نہیں جیسا کہ بعض لوگ کہتے پھرتے ہیں بلکہ یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اللہ کے نبی کے تصدیق شدہ ہیں۔

امت اسلامیہ کے جلیل القدر اولیاء اللہ مثلاً سیدنا صدیق اکبر، سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری، شیخ ابراہیم بن ادہم، شیخ معین الدین چشتی، شیخ بختیار کاکی، شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ مجد الف ثانی، حاجی امداد اللہ مہاجر کی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا خواجہ خان محمد، بانی جامعہ اشرفیہ مفتی محمد حسن، سید نفیس الحسینی، مولانا ابرار الحق ہردوئی، مولانا شاہ حکیم محمد اختر، سید محمد امین شاہ رحمہم اللہ، فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالحفیظ کی، پیر طریقت عزیز الرحمن ہزاروی، محبوب الصلحاء پیر ذوالفقار احمد نقشبندی وغیرہ جیسے سینکڑوں نہیں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد ایسے ہیں جن کے واسطے سے یہ قلبی و روحانی تربیتی نظام آج ہم تک پہنچا ہے اسی نظام میں انسانیت کے لیے باہمی محبت، رواداری، ایثار، مواسات، ہمدردی، خیر خواہی، اخوت، مروت اور یگانگت ہے۔ یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے پھوٹنے والے چشمہ صافی میں ہمارے معاشرتی زہر کا سامان تریاقی موجود ہے۔ اگر ہم اسی نظام سے مربوط رہیں تو ہماری اخلاقی قدریں بلند ہو سکیں گی۔

فتاویٰ پر زمانہ و حالات کی تبدیلی کا اثر

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

دنیا کے بیشتر مذاہب کا حال یہ ہے کہ ان کے ماننے والوں کا رشتہ اپنے مذہب سے کٹ چکا ہے، ان کے یہاں صرف دو چیزوں میں مذہب کی حکمرانی قائم ہے ایک: عبادت اور پوجا پاٹ، دوسرے: تہوار اور قدیم زمانہ سے مروج مذہبی تقریبات، اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے مذہب کو نکال باہر کر دیا گیا ہے، ان کے یہاں زندگی کے عام مسائل میں حلال و حرام کا تصور باقی نہیں رہا؛ اسی لئے ان کے یہاں کوئی ایسا ادارہ نہیں پایا جاتا، جو مذہبی نقطہ نظر سے رہنمائی کرے کہ کن کاموں کو کرنا چاہیے اور کن کو نہیں کرنا چاہیے؟ ان کے یہاں مذہبی پیشواؤں کا رول صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ وقت اور مقام کے بارے میں مبارک اور منحوس کی نشاندہی کریں، شادی بیاہ کی اور موت کی رسوم انجام دیں اور بس، اور یہ بھی اس لئے کہ ان کاموں سے مذہبی پیشواؤں کی آمدنی متعلق ہوتی ہے۔

اس سے صرف مسلمانوں کا استثناء ہے، ہر مسلمان اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ ہم پر صرف عبادات یعنی نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی میں احکام شریعت کی پابندی ضروری نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کے تمام مسائل میں اس کی دنیا و آخرت کی بھلائی احکام شریعت کی پیروی سے جڑی ہوئی ہے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، تجارت و کاروبار، خاندانی زندگی، لوگوں کے حقوق، جرم و سزا، سیاسی مسائل، مختلف قوموں کے ساتھ ارتباط غرض کہ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے آزاد ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا عبد ہے، یعنی ۲۴ گھنٹے کا غلام، ایسا غلام جو ہر چھوٹا بڑا کام اپنے آقا

کے چشم و آبرو کے اشارہ پر کرتا ہو، جس کی نظر میں اپنے مالک کی خوشنودی کے لئے کھونا ہی پانا اور مرنا ہی جینا ہو اور جو اپنے خدا کے لئے لٹ جانے ہی کو سب سے بڑی سرفرازی اور کامیابی تصور کرتا ہو۔

زندگی میں ایسی ہمہ گیر اطاعت و فرمانبرداری کے لئے ایک ایسے ادارہ کی ضرورت تھی، جو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے سلسلے میں عام مسلمانوں کی رہنمائی کرے، اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مسلم معاشرہ میں فتاویٰ کا نظام قائم ہے، قرآن و حدیث میں شریعت کے جو احکام آئے ہیں، ان میں بعض ایسی صراحت و وضاحت کے ساتھ منقول ہیں کہ ان میں کوئی ابہام نہیں ہے اور بعض وہ ہیں جو قابل تحقیق ہیں کہ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک درست ہے؟ یا قرآن و حدیث میں کوئی حکم ایسے الفاظ میں دیا گیا ہے، جن میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہے، ایسی ہدایات کے بارے میں اہل علم تحقیق و جستجو کے ذریعے ان کی مراد متعین کرتے ہیں، اسی کو اسلامی قانون کی اصطلاح میں 'اجتہاد' کہا جاتا ہے اور شریعت کی واضح تعلیمات اور فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کا نام 'فتویٰ' ہے، مسلم سماج میں عہد نبوی اور عہد صحابہ سے ہمیشہ ایسے لوگ رہا کئے ہیں، جو فتویٰ دینے کی ذمہ داری انجام دیا کرتے تھے، مسلم حکومتوں میں بھی مفتی کا منصب ہوا کرتا تھا اور آج بھی بہت سے مسلم ملکوں میں مفتی کا منصب موجود ہے، جب کہ غیر مسلم ممالک میں دینی درسگاہیں اس فریضہ کو انجام دیتی ہیں، اس سلسلے میں خاص طور پر برصغیر کی ایک روشن تاریخ رہی ہے؛ چنانچہ فتاویٰ کے کتنے ہی مجموعے ہیں، جو نہ صرف عربی زبان بلکہ مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

قرآن و حدیث کے احکام میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ ہمیشہ اسی

تفصیل کے ساتھ باقی رہیں گے؛ لیکن اجتہادی احکام کی بنیاد بعض اوقات وقتی حالات، رواجات اور موجودہ آلات و وسائل پر ہوتی ہے، ایسے فتاویٰ پر بدلتے ہوئے حالات کا اثر پڑتا ہے، اسلامی قانون میں بعض حصوں کا ہمیشہ اپنی حالت پر قائم رہنا جہاں اس کو استحکام اور عدل و انصاف قائم کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف فقہ و فتاویٰ میں اپنے عہد کی تبدیلیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت اس کو ہر عہد میں قابل عمل بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسی پس منظر میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں قائم ”شیخ محمد ابراہیم ملفتویٰ چیئر“ کے تحت ’فتاویٰ میں تبدیلی اور زمانہ و حالات کے اثرات‘ کے زیر عنوان ایک بین الاقوامی سیمینار بتاریخ ۱۸-۱۹ نومبر ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوا، جس میں اس بات پر بحث کی گئی کہ فتاویٰ پر زمان و مکان اور حالات کی تبدیلی کا کیا اثر پڑتا ہے اور خود فتاویٰ سماج پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟

اس سیمینار میں لوگوں کو براہ راست مقالہ پڑھنے یا شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی؛ بلکہ دنیا بھر سے فقہاء، اصحابِ افتاء، فقہ اور اصول فقہ پر کام کرنے والے مصنفین سے مقالہ لکھنے کی درخواست کی گئی، جن کی طرف سے پانچ سو مقالات وصول ہوئے، ان میں سے ڈیڑھ سو پہلے ہی مرحلہ میں چھانٹ دیئے گئے، بقیہ ساڑھے تین سو مقالات جائزہ کمیٹی (مجلس التحکیم) کو سپرد کئے گئے، کمیٹی نے ان مقالات کا جائزہ لے کر ۶۸ کا انتخاب کیا، ان ہی حضرات کو سیمینار میں مدعو کیا گیا؛ چونکہ یہ مقالات کافی پہلے طلب کر لئے گئے تھے، اس لئے سیمینار کے موقع سے ہی چھ جلدوں میں ان کی طباعت بھی عمل میں آگئی، پہلے سے ہر مقالہ نگار کو لکھ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مقالہ کا خلاصہ ایک تا ڈیڑھ صفحہ میں لکھیں اور اسی کو سیمینار میں پیش کریں؛ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ وقت

کی کمی کی وجہ سے اس خلاصہ کو بھی پیش کرنے کی گنجائش نہیں رہی اور ہر مقالہ نگار کو پانچ منٹ کا وقت دیا گیا کہ وہ اس میں مقالہ کی بنیادی فکر کو پیش کرے، کسی لمبی بات کو مختصر کرنا اور پھر اچانک اس کو مختصر تر کرنا آسان نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

۶/ صفر ۱۴۳۷ھ کو صبح نو بجے مدینہ یونیورسٹی کے 'ملک سعود آڈیٹوریم' میں پروگرام کا آغاز ہوا، جامعہ کے کلیۃ القرآن کے ایک استاذ نے بڑی نفیس آواز میں تلاوت کی، شیخ محمد ابراہیم چیئر کے استاذ ڈاکٹر سلیمان رحیلی نے استقبالیہ کلمات کہے، پھر جامعہ ازہر کے ایک بزرگ استاذ اور مالدیپ کے صدر نے بحیثیت مہمان خطاب کیا، یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ابراہیم بن علی عبید کا کلیدی خطاب ہوا، پھر مملکت کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ نے اپنے خطاب کے ذریعہ سیمینار کا باضابطہ طور پر افتتاح فرمایا، شیخ عام طور پر مختصر خطاب پر اکتفا کرتے ہیں؛ لیکن آج انھوں نے نسبتاً تفصیل سے فتویٰ کی اہمیت اور اس کی نزاکت پر روشنی ڈالی، تمام ہی مقررین کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ فتویٰ دینا ایک نازک کام ہے، اس کے لئے گہری بصیرت اور ورع و دیانت ضروری ہے، اور آج کل اس سلسلہ میں جس بے احتیاطی سے کام لیا جا رہا ہے، اس سے امت کے لئے نئی مشکلات جنم لے رہی ہیں۔

اس کے بعد کل سات نشستیں منعقد ہوئیں، جن میں سے چھ نشستیں متوازی طور پر ہوتی رہیں، ایک: ملک سعود آڈیٹوریم میں، دوسری: کلیۃ الدعوة و اصول الدین کے سیمینار ہال میں، ساتویں نشست ملک سعود آڈیٹوریم میں مشترک طور پر ہوئی، تمام نشستوں کی صدارت سعودی عرب کے بڑے علماء و مشائخ نے فرمائی، جن میں شیخ عبد الرحمن سدیس خطیب حرم مکی و صدر امور حرمین شریفین، شیخ حسین بن عبدالعزیز

آل شیخ امام و خطیب مسجد نبوی اور شیخ صالح بن حمید امام و خطیب حرم مکی و مشیر دیوان مکی شامل ہیں۔

یہ نشستیں ۷/ صفر ۱۴۳۷ھ، جمعرات کو بارہ بجے دن تک مکمل ہو گئیں اور اختتامی نشست ساڑھے بارہ سے ڈیڑھ بجے تک منعقد ہوئی، جس میں اعلامیہ اور تجاویز کی خواندگی ہوئی، یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اس آخری نشست کی صدارت کی۔

اس سیمینار میں نہایت اہم موضوعات پر مقالے پیش کئے گئے، جیسے جدید مسائل پر فتویٰ دینے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اقتصادی نظام میں آنے والی تبدیلیوں کا فتویٰ پر کیا اثر پڑتا ہے، ٹیکنالوجی کی ترقی، سماجی تعلقات اور میڈیکل دنیا میں پیدا ہونے والے جدید وسائل کے سلسلہ میں مفتی کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے؟ مسلمان اقلیتیں جن حالات سے دوچار ہیں، مختلف ملکوں میں ان مسائل کو کیسے حل کیا جائے، عرف و رواج اور زمان و مکان کی تبدیلی سے نمٹنے کے لئے فقہاء نے کیا راہ دکھائی ہے، موجودہ دور میں فتاویٰ کے سلسلہ میں بے جاشدت یا بے جازمی یا کسی مناسب سبب کے بغیر مسلمانوں کی تکفیر جیسے مسائل سے عالم اسلام کو کیا نقصان پہنچ رہا ہے؟ یہاں تک کہ دنیا کے بہت سے خطوں میں اس کی بنیاد پر برادر کشی کی نوبت آگئی ہے اور فکری اختلاف نے نوبت قتل و قتال تک پہنچادی ہے، ان تمام پہلوؤں پر بڑے اہم مقالات پیش کئے گئے۔

اس حقیر کا مقالہ پہلی نشست میں رکھا گیا تھا، جس کا عنوان تھا ”فتاویٰ میں تبدیلی — مثالیں، قواعد اور احکام“ (تغیر الفتویٰ نظائر و ضوابط و احکام) شیخ سدیس اس نشست کی صدارت کر رہے تھے، انہوں نے شروع میں فتاویٰ کے موضوع پر مختصر؛ لیکن جامع اور مفید گفتگو کی، اس کی وجہ سے وقت اور مختصر ہو گیا، اس حقیر نے صورت

حال کو دیکھتے ہوئے اپنے مقالہ کے خلاصہ کو سات نکات پر تقسیم کر دیا تھا، جن میں ہر نکتہ صرف دو تین فقروں پر مشتمل تھا، اس کا یہ فائدہ ہوا کہ بغیر روک ٹوک کے بات پوری ہو گئی، شیخ سدیس ہر مقالہ پر دو چار جملوں میں چچا تلاتبرہ کرتے جاتے تھے، میری اس تحریر پر انھوں نے کہا کہ جب مضمون وسیع الجہات ہو اور وقت کم ہو تو اپنی بات پیش کرنے کے لئے یہ منہج بہت بہتر ہے جو فاضل مقالہ نگار نے اختیار کیا ہے کہ اپنی بات نمبر وار ذکر کر دی جائے؛ تاکہ اصل مقصد سامنے آجائے اور بات لمبی بھی نہ ہو۔ راقم الحروف نے جو کچھ عرض کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1: حکم شرعی اور فتویٰ دونوں بالکل ہم معنی نہیں ہیں، ان دونوں کے درمیان ایک دقیق فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ حکم شرعی تو بندوں کے افعال سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جس کی حیثیت اصل اور بنیاد کی ہے اور جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہے، جب کہ فتویٰ اللہ تعالیٰ کے احکام کو موجودہ حالات و واقعات پر منطبق کرنے سے عبارت ہے اور اس میں انسان سے غلطی واقع ہو سکتی ہے۔

2: فتاویٰ میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ انسان کے کسی عمل کا جو حکم بیان کیا جاتا تھا، اب اس پر اس کے بجائے دوسرا حکم لگایا جائے، جیسے کسی چیز کو گذشتہ فقہاء نے اپنے اجتہاد سے حرام قرار دیا تھا، بعد کے فقہاء نے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اسے مباح قرار دیا ہو، یا جس کو گذشتہ اہل علم نے جائز قرار دیا تھا، فتنہ کے اندیشہ یا حالات میں تبدیلی کی وجہ سے بعد کے ارباب افتاء نے اس کو ناجائز قرار دیا ہو، قرن اول ہی سے اس کی مثالیں موجود ہیں۔

3: جن فتاویٰ کی بنیاد قرآن مجید، معتبر حدیث یا اجماع پر ہو، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، ان میں تبدیلی کا مطالبہ گمراہی اور دین سے انحراف ہے، جیسا کہ آج کل

بعض مغرب زدہ دانشوروں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

4: جن فتاویٰ کی بنیاد قیاس و اجتہاد، عرف و رواج یا کسی خاص زمانے کی مصلحت پر ہو، ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے؛ بلکہ بعض حالات میں واجب ہو جاتی ہے، سلف صالحین کا ہمیشہ سے اس پر عمل رہا ہے، علامہ ابن عابدین شامی، علامہ ابو اسحاق شاطبی، علامہ قرانی اور علامہ ابن قیم جیسے عبقری علماء نے اس کی صراحت کی ہے۔

5: جن مسائل میں احادیث یا صحابہ کے فتاویٰ بظاہر متعارض ہوں یا کسی حدیث کے معتبر ہونے اور نہ ہونے میں معتبر فقہاء اور محدثین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہو اور مختلف علماء نے اپنے ذوق کے مطابق ترجیح سے کام لیا ہو تو زمانے کی تبدیلیوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے ترجیحات میں تبدیلی ہو سکتی ہے، یہ جو مذاہب اربعہ کے فقہاء نے بوقت ضرورت دوسرے مکتب فکر سے استفادہ کی اجازت دی ہے، وہ اسی قبیل سے ہے۔

6: فتاویٰ میں تبدیلی کی ضرورت پیش آنے کے بنیادی اسباب ”عرف و عادت میں تبدیلی، اخلاقی قدروں کا انحطاط، جدید آلات و وسائل کی پیدائش، مقام، جیسے مسلم اور غیر مسلم ممالک کا فرق، اقتصادی اور سیاسی نظام میں تبدیلی، وغیرہ“ ہیں، جن کی وجہ سے فتاویٰ میں تبدیلی کی نوبت آتی ہے۔

7: فتاویٰ میں تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجماع اور قطعی دلیل کے خلاف نہ ہو، شریعت کے بنیادی مقاصد سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو، اس کی مصلحتوں سے اس کے مفاسد بڑھ نہ جائیں اور ایسے فقہاء کی ایک جماعت اس کام کو انجام دے جو فقہی بصیرت بھی رکھتی ہو، اپنے زمانہ کے احکام پر بھی اس کی نظر ہو اور ورع و تقویٰ کی بھی حامل ہو۔

اس اجلاس میں زیادہ تر عالم اسلام بلکہ عالم عرب کے نمائندے شریک تھے، برصغیر سے صرف یہ حقیر ہی شریک تھا، معلوم ہوا کہ پڑوسی ملک سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب تشریف لانے والے تھے؛ لیکن وہ نہیں پہنچ سکے، سبھوں کا ایک مشترک احساس یہ تھا کہ موجودہ دور میں فتاویٰ میں غیر معمولی افراط و تفریط پائی جاتی ہے، ایک طرف مغربی ملکوں میں مقیم بعض وہ اہل علم ہیں جو منصوص مسائل میں بھی تغیر کی بات کرتے ہیں، دوسری طرف قرآن و حدیث پر عمل کے دعوے دار وہ لوگ ہیں جو اپنے سوا تمام مسلمانوں کے عمل کو غلط ٹھہراتے ہیں، یہاں تک کہ بعض غالی حضرات اس کی وجہ سے دوسروں کی تکفیر کرنے سے بھی نہیں چوکتے، تیسری طرف وہ متشددین ہیں جنہوں نے اپنے مخالف نقطہ نظر کو نہ صرف کافر قرار دے دیا ہے؛ بلکہ ان کے قتل کو بھی جائز ٹھہرا دیا ہے اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف تلوار لے کر میدان میں کود پڑے ہیں، یہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اعدائے اسلام کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں، مساجد میں خود کش حملے، مسلکی بنیاد پر لوگوں کا قتل، پر تشدد طریقوں کا استعمال اور مخالفین کے ساتھ ایسی بے دردی اور سفاکی اختیار کرنا، جو اسلام اور انسانیت کے سراسر خلاف ہے، میں فتاویٰ دینے میں بے احتیاطی کا بھی دخل ہے۔

اسی طرح آج کل مختلف ٹیلی ویژن پر ایسے لوگوں کو مفتی مقرر کیا جا رہا ہے، جنہیں نہ کتاب و سنت میں بصیرت حاصل ہے اور نہ فقہ سے کوئی مناسبت ہے، یہی حال انٹرنیٹ پر چلنے والی فتاویٰ کی بہت سے سائٹوں کا ہے، ان سے نوجوان گمراہ ہو رہے ہیں، ان میں کہیں انتہا پسندی، غلو، اور کہیں اباحت پیدا ہوتی ہے؛ اس لئے مسلم سماج کی تربیت ہونی چاہئے کہ فتویٰ دینے کی ذمہ داری ایسے لوگوں کو دی جائے جو واقعی اس کے اہل ہوں اور ایسے ہی لوگوں کے فتاویٰ قبول کئے جائیں۔

دنیا بھر کے مسلمانوں اور خود مسلمانانِ ہند کے لئے اس کانفرنس کا اصل پیغام یہی ہے کہ مختلف نقطہ نظر کے حاملین فتاویٰ میں ایسے غلو کا راستہ اختیار نہ کریں کہ اختلاف، اختلافِ رائے سے بڑھ کر جدال اور جدال سے بڑھ کر قتل و قاتل تک پہنچ جائے، ایک دوسرے کی تکفیر کی جائے اور اختلافِ رائے کو ایسے نفرت انگیز طریقہ پر پیش کیا جائے کہ اسلامی اخوت کی بنیادیں ریزہ ریزہ ہو جائیں اور انسانیت کو بھی شرمسار ہونا پڑے، جیسا کہ اس وقت ہمارے پڑوسی ملک کی حالت ہے۔

سعودی عرب کے کسی علمی پروگرام میں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے، اس سفر میں پانچ دنوں مدینہ منورہ میں قیام کا موقع ملا، چونکہ حجاج جاچکے تھے اور عمرہ ویزا شروع نہیں ہوا تھا؛ اس لئے اژدہام نہیں تھا، ہم لوگوں کا ہوٹل بھی مسجد نبوی کے صحن سے متصل اور روضہ نبوی کے قریب تھا اور عصر سے فجر تک کا وقت خالی ہوتا تھا؛ اس لئے بار بار روضہ شریف پر حاضر ہونے اور دیر تک اپنی گناہ گار زبان سے صلاۃ و سلام پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوتی تھی۔

ایک غلام بے دام کے لئے اس سے بڑھ کر شرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے آقا کے مبارک قدموں میں کھڑے ہونے کا موقع مل جائے، اسی طرح ریاض الجنۃ میں بھی آسانی کے ساتھ اور دیر تک نماز پڑھنے کا موقع ملا، غالباً اس سے پہلے اتنی سہولت سے اور اتنی دیر تک یہ مواقع میسر نہیں آئے تھے، مکہ مکرمہ بھی میں بھی طواف میں بڑی سہولت رہی اور مختصر لیکن بہتر طور پر وقت گزارنے کا موقع ملا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس گناہ گار بندے کو بار بار اپنی چوکھٹ پر حاضری دینے اور اپنے ایمان کو تازہ کرنے کا موقع عطا فرمائے۔

قوموں کا عروج و زوال

مولانا ابوالحسن علی ندوی

قوموں کا عروج و زوال قانون فطرت ہے کسی بھی قوم کا اقتدار اور عروج و زوال دیر پا ضرور ہو سکتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں، قوموں کا عروج و زوال اگرچہ فطری قانون کے مطابق ہوتا ہے تاہم ایسا نہیں ہوتا ہے کہ اس میں اسباب و عوامل کو کچھ دخل نہ ہو، کسی بھی قوم کے عروج و زوال میں بہت سے اسباب و عوامل فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں، قوموں کے بارہا کے عروج و زوال کو دیکھتے ہوئے ان عوامل کو طے کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ قوموں کے عروج و زوال میں عام طور پر مندرجہ ذیل عوامل کو بہت زیادہ دخل ہے۔

کسی خاص نظریے پر متفق ہو جانا:

کسی قوم کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اسکے افراد کسی ایک نظریے پر یک جان و یک قالب ہو جائیں، یہ نظریہ ان کے رگ و ریشہ میں اس طرح سما جائے کہ انکا س سے دستبردار ہونا کسی طور پر بھی ممکن نہ ہو۔ قوموں کے کسی خاص نظریے پر متفق ہو جانے کو ابن خلدون عصبيت سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ نظریہ کسی خاص عصبيت دینیہ، دنیویہ، روحانیہ یا مادیہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ پختہ عقیدہ و نظریہ جس کی بنیادیں غیر متزلزل اور مضبوط ہوں کسی بھی قوم کے غلبہ اور تفوق کی راہیں کھول دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے جو عالمگیر انقلاب برپا کیا اسکے لئے اولاً مضبوط بنیادوں کی منصوبہ بندی کی، یہ بنیادیں اس قدر مضبوط، مستحکم اور غیر متزلزل تھیں کہ ظلم و ستم کے پہاڑ، مخالفت کے طوفان اور فتنہ کی آندھیاں انھیں مگر ان میں ذرا بھر بھی جنبش نہ آئی۔ آپ ﷺ

نے ان بنیادوں کے مضبوط کرنے کے لئے مکی زندگی کے تیرہ سال لگائے، آپ ﷺ مکہ میں تیرہ سال تک توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان کی دعوت دیتے رہے اور اپنے ساتھیوں کے دلوں میں ان کا یقین بٹھاتے رہے، آپ کے ساتھیوں کا ایمان اور یقین اس قدر پختہ اور مضبوط ہو گیا تھا کہ اس یقین کی راہ میں حائل ہونے والے تمام مالوفات و مانوسات اور رشتوں و ناطوں کو چھوڑنا اور توڑنا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس مضبوط ایمان کو لے کر جب یہ نکلے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکی اور یہ دنیا پر غلبہ پاتے چلے گئے۔

نتیجہ کچھ ہی سالوں میں نصف دنیا پر انہوں نے اسلام کا پھریرا لہرایا اور ساٹھ سال اس پختہ ایمان و یقین کی بدولت حکومت کی، لیکن آہستہ آہستہ یہ یقین و اعتقاد کمزور اور ضعیف ہوتا گیا، نبی اکرم ﷺ کے براہ راست تربیت یافتہ کم یا ختم ہوتے چلے گئے اور یوں مسلمانوں کے زوال کی راہیں کھلتی چلی گئیں اور مسلمان کچھ ہی عرصہ میں روبہ زوال ہوئے۔ اہل روم اور یونان بھی اپنے اصل نظریات سے انحراف اور روگردانی کی وجہ سے روبہ زوال ہوئے، جب ان کا اعتقاد ضعیف ہو گیا اور ایمان راسخ نہ رہا تو توہمات نے اسکی جگہ لے لی، یہی چیز ان کے زوال کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔

اس نظریے پر سخت جدوجہد اور قربانی:

کسی بھی قوم کے نظریے کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس نظریے پر سخت جانفشانی کے ساتھ مسلسل و پیہم جدوجہد کی جائے اور اسکی کامیابی کے لئے دن رات ایک کر دیئے جائیں اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔ قوموں اور تحریکوں کے غلبے، ترقی اور عروج کے پیچھے ہمیشہ ایک طویل عرصہ کی محنت، جانفشانی اور قربانی ہوتی ہے۔ حرکت اور ترقی کا آپس میں گہرا

تعلق ہے قرآن کریم نے بھی انسان کی کامیابی کو اسکی محنت کے ساتھ جوڑا ہے ارشاد ربانی ہے ”اور انسان کیلئے وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔“ (سورہ نجم، ۳۹)

آپ ﷺ اس عظیم الشان دعوت کو لے کر اٹھے تو آپ نے جدوجہد و جانفشانی کا حق پوری طرح ادا کیا، اس دعوت کو ہر اس چیز پر ترجیح دی جو آپ کیلئے رکاوٹ بن سکتی تھی، آپ خواہشات سے بالکل کنارہ کش تھے، آپ کی جدوجہد اور جانفشانی کا اندازہ آپ کے اس ارشاد سے بخوبی ہو سکتا ہے جو آپ ﷺ نے اپنے چچا کی پیشکش کے جواب میں فرمایا تھا ”اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں اس کام سے باز نہیں آسکتا اور اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس دعوت کو غالب نہ کر دے یا میں خود اس سلسلہ میں کام نہ آ جاؤں۔“

آپ نے اس سلسلہ میں اپنے اوپر عیش و آرام راحت و آسائش کے دروازے بند کر لئے اور خود اپنے ہی اوپر نہیں بلکہ اپنے پورے خاندان، اہلبیت اور تمام عزیزوں کو بھی عیش و عشرت کے مواقع سے مستفید ہونے کا موقعہ نہیں دیا، اسی طرح صحابہ اکرام نے بھی اس دعوت کو پھیلانے اور آگے بڑھانے میں بے پناہ محنت کی اور قربانیاں دیں، مکہ کے لوگ جب ایمان لائے تو راحت و آرام کے سامان اور آرائش و زینت کے اسباب ختم کر دیے، ان کی تجارت کساد بازاری کا شکار ہو گئی اور بعض اپنے راس المال سے بھی محروم ہو گئے۔

یہی حال انصار مدینہ کا تھا، اسی نظریے کی کامیابی کے لئے آپ اور آپ کے صحابہ کرام نے جہاد بھی کیا، اور پھر جن حالات میں آپ نے صحابہ کرام کے ہمراہ جہاد کیا اس پر دنیا داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی، یہ ایک طویل جدوجہد تھی جس کی بدولت

مسلمانوں نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جو صدیوں تک قائم رہی۔ جس طرح کسی بھی قوم کے نظریے کا بار آور ہونا ایک طویل محنت پر موقوف ہے، اسی طرح کسی بھی ترقی یافتہ قوم پر زوال تب آتا ہے جب اس کے افراد محنت چھوڑ کر تن آسانیوں اور عیاشیوں میں پڑ جاتے ہیں اور اسی کی دوڑ دھوپ میں ان کے صبح و شام گزرتے ہیں۔ ایران، روم اور مسلمان کسی بھی ترقی یافتہ اور غالب قوم کو دیکھ لیں ایک عرصہ تک تو یہ جانفشانی کے ساتھ محنت کرتے رہے پھر یہ ایسی تن آسانیوں اور عیاشیوں میں پڑے کہ مقصد اصلی سے غافل ہو گئے نتیجہ دوسری محنت کش اقوام ان پر آسانی سے غالب آ گئیں۔

اہل حکمران :

کسی بھی قوم اور تحریک کے نظریات اور محنت میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اچھے، اہل، قابل اور اصلاح و تربیت یافتہ حکمران میسر ہوں جو ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو مقدم رکھتے ہوں، شخصی اقتدار کیلئے اداروں کو ذبح نہ کرتے ہوں۔ ایک اچھا حکمران نہ صرف قومی مفاد اور مصالح کی مد نظر رکھتا ہے بلکہ قوم کے افراد کی صلاحیتوں کو بھی چمکاتا اور صیقل کرتا ہے، اس طرح انکو زندگی کے ہر میدان میں کام پر لگاتا ہے۔ رسول اللہ اور خلفائے راشدین کا عہد اقتدار اسکی بہترین مثال بن سکتا ہے کہ جس میں مسلمانوں نے بے پناہ ترقی کی اور نصف دنیا پر حکمران بنے۔ لیکن اس کے بعد کے زمانوں میں جب حکومت کے لئے اہلیت شرط نہ رہی، حکمران عیش و عشرت میں پڑ گئے، قومی دولت کو ذاتی دالت سمجھا جانے لگا اور اقتدار ایک ہی خاندان کی ذاتی ملکیت بن کر رہ گیا تو اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی آہنی دیوار میں کئی رخنے پیدا ہو گئے جن سے مسلسل فتنے اور مصائب نفوذ کرتے رہے اور مسلمان رو بہ زوال ہوئے۔

خلفائے راشدین کے بعد بھی مسلمانوں نے اہل اور نیک حکمرانوں کے دور حکومت میں بے پناہ ترقی کی، جس سے اچھے اور برے حکمران کے ریاست پر پڑنے والے اثرات مزید نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اسلام سے قبل کی قوموں ایران، روم، یونان اور ہند کے زوال کا بڑا سبب ان کے نااہل حکمران تھے۔ ان علاقوں میں حکمرانی مخصوص خاندان کا حق تھی، اہلیت اس کے لئے مطلقاً شرط نہ تھی۔ چنانچہ ایران میں حالت یہ تھی کہ شیرویہ کے بعد اس کے ہفت سالہ بیٹے اردشیر کو شہنشاہ تسلیم کیا گیا، اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو طفلی کی حالت میں لوگوں نے بادشاہ بنا دیا اور کسری کی لڑکی بوران بھی تخت نشین ہوئی، اس تمام صورتحال میں کسی کو بھی یہ تصور نہ آیا کہ کسی سپہ سالار یا بڑے سردار یا کسی دوسرے لائق اور آزمودہ کار شخص کو انتظام سلطنت سپرد کر دیں، چونکہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق نہ رکھتے تھے اس لئے انکے حکمران بننے کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح روم میں بھی حکمرانی ایک پیشہ تھی اور بادشاہ کا بیٹا ہی بادشاہ بنتا تھا۔ یہی حالت ہندوستان میں تھی جہاں صرف کھستری ہی حکومت کے اہل تھے اور کوئی نہیں۔

اور ان علاقوں کے حکمران بہت زیادہ عیاش اور فضول خرچ تھے، قومی دولت کو ذاتی دولت سمجھتے تھے۔ ان کی عیاشی کے واقعات چشم کشا اور حیران کن ہیں، شاہان ایران میں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں تک ممکن ہو تا اپنے خزانے میں نقد روپیہ اور قیمتی اشیاء جمع کرتے، خسرو دوم نے مدائن میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں ۴۶ کڑوڑ اسی لاکھ مثقال سونا تھا، حکومت کے تیر ہوں سال کے بعد اس کے خزانہ میں اسی لاکھ مثقال سونا تھا، خسرو دوم کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ خالص سونا تھا، عیش

پرستی کا یہ عالم تھا کہ کسری پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں، پچاس ہزار اسیل گھوڑے، اس قدر سامان تعیش، محلات اور نقد و جواہر تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو ان کے سامانوں سے بیش قیمت جوڑے، طلائی، سنگار کا سامان وغیرہ ملے۔

طبری کی روایت ہے کہ عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے جو سر بمبر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے، عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ اس میں کچھ کھانے کا سامان ہو گا کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے، چاندی کے برتن ہیں۔ اسی طرح مؤرخین نے فرش بہار کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا تھا، اسکی زمین سونے کی تھی جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی، چمن تھا جس میں درختوں کے پتے حریر کے اور لکڑی سونے کی تھی، اس پر تاجداران آل ساسان خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے۔ شہنشاہان روم کی حالت بھی انہی جیسی تھی۔

حسان بن ثابت نے جبکہ بن ابہم غسانی کی مجلس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ جبکہ کے پاس دس باندیاں گایا کرتی تھیں، جب شراب پیتا تھا تو اس کے نیچے فرش پر قسم قسم کے پھول بچھادئے جاتے، سونے چاندی کی طشتریوں میں مشک و عنبر لگا دیا جاتا اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا تھا۔ ایک ایک شخص اپنی ذات پر اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا جس سے پوری ایک بستی کی پرورش ہو سکے، یا پورے گاؤں کی پوشاک اور ستر پوشی کے لئے کافی ہو۔

حکمرانوں کی یہی نا اہلی، عیاشی اور فضول خرچی ان علاقوں اور قوموں کے زوال کا سبب بنی۔ اور آج بھی ترقی یافتہ قوموں یورپ، روس اور چائنا وغیرہ کی ترقی میں ان کے حکمرانوں کا بہت بڑا کردار ہے اور امت مسلمہ کے زوال میں اس کے

حکمرانوں کی نا اہلی کا بہت دخل ہے۔

یورپ میں آج بہت خرابیاں آچکی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ زندہ ہی نہیں برسرِ اقتدار ہے تو اسکی وجہ انکی قیادت کا سیاسی شعور اور قومی ذمہ داریوں کا احساس ہے، ابھی تک انگریزوں اور امریکیوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں شاذ و نادر ہوں گی جو قومی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوں، اپنے ملک کو ستے داموں فروخت کرتے ہوں، حکومت کے اسرار فاش کرتے ہوں یا خراب و ناکارہ اسلحہ کی خریداری کے مجرم ہوں، اور مسلمان ممالک کے قائدین اور صاحبانِ اقتدار سے کچھ بعید نہیں کہ کبھی اپنے کسی حقیر فائدہ یا لذت و خواہش کے ماتحت اپنے ملک کو رہن رکھ دیں یا اس کا بیعنامہ کر دیں یا اپنی قوم کو بھیڑ بکری کی طرح فروخت کر دیں یا اپنی قوم کو ایسی جنگ میں جھونک دیں جو مصلحت کے خلاف ہو، مجموعی طور پر آج امت مسلمہ کے حکمرانوں کی عیاشیاں و فحاشیاں دیکھ کر یورپ کا سر بھی شرم سے جھک جاتا ہے۔

طبقاتی نظام:

طبقاتی نظام عموماً حکمران اور اشرافیہ خود پیدا کرتے ہیں تاکہ خود تو عیاشی میں رہیں اور عوام ان کے لئے دوڑ دھوپ کرتی رہے۔ طبقاتی نظام میں جہاں محنت اور مشقت صرف ایک فریق کرتا ہے وہاں عدل و انصاف اور قوانین ریاست بھی عموماً ایک فریق کیلئے ہی ہوتے ہیں، اشرافیہ اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ظلم میں پسا ہوا یہ طبقہ احساس محرومی کی وجہ سے کبھی بھی حکمرانوں کے ساتھ مخلص نہیں ہوتا ہے یا خود ایک دن حکمرانوں کی عیاشیوں کی بساط لپیٹ دیتا ہے یا کسی بیرونی دشمن آنے کی صورت میں ان کیلئے راہیں ہموار کر دیتا ہے۔ ماقبل اسلام میں زوال یافتہ قوموں کے اندر یہ بات مشترک تھی، ایران روم دونوں سلطنتیں بدترین طبقاتی نظام کا شکار تھیں ان دونوں

مملکتوں میں رعایا دو طبقوں میں تقسیم تھے، ان دونوں طبقوں میں واضح اور بین فرق تھا ایک طبقہ بادشاہوں، شہزادوں، اہل دربان اور ان کے خاندانوں، عزیزوں، متعلقین، وابستگان اور جاگیر داروں اور دولتمندوں کا تھا، یہ لوگ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے تھے، ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیتے اور دودھ و گلاب میں نہاتے، یہ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کنوَاب سے سجاتے تھے۔

دوسرا طبقہ کاشتکاروں، کاریگروں، اہل حرفہ اور چھوٹے تاجروں کا تھا جنکی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی، جن کا جوڑ جوڑ اور بند بند مطالبات کے اندر جکڑا ہوا تھا، وہ اس جال کو توڑنے کی جس قدر کوشش کرتے تھے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے وہ اور کس جاتا تھا۔ عرب دنیا بھی آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھی، بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ حج کے بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے، عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے، ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں اور دوسرا کم حیثیت لوگوں کا تھا جن سے بیگار لیا جاتا اور کام پر لگایا جاتا تھا۔

سب سے بری طبقہ واریت ہندوستان میں تھی کسی قوم کی تاریخ میں اس قدر بین طبقہ واری امتیاز اور پیشوں اور زندگی کے مشغلوں کی ایسی امنٹ اور اٹل تقسیم کم دیکھنے میں آئی ہے جیسی ہندوستان کے قدیم مذہبی و معاشرتی قانون میں ہے۔ آریوں نے اپنی نسل اور اس کی خصوصیات کو محفوظ رکھنے اور اپنا تفوق و برتری برقرار رکھنے

کے لئے اس طبقہ واری تقسیم اور نسلی امتیاز کو ضروری سمجھا، ستم بالا یہ تھا کہ منوجی نے اس کو ایک قانون بنادیا اور تمام اہل ملک نے اسکو بالاتفاق قبول کر لیا۔ منوجی نے معاشرے کو چار طبقوں میں تقسیم کیا، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔

ان تمام ممالک و قوموں کی طبقہ واریت سے ہٹ کر رسول اللہ نے انسانی مساوات کا ایسا پیغام دیا جس میں کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت اور تفوق نہیں، سبھی ایک باپ آدم کی اولاد ہیں۔ آپ کے اس مساوات کے نظام میں آپ کو بھی رعایا کے ایک عام آدمی جتنے حقوق میسر تھے اور آپ ﷺ کی زندگی بھی ایک عام مسلمان کی مانند گزرتی تھی۔ آپ کے اس نظام مساوات کا نتیجہ تھا کہ آقا و غلام پر ایک لباس نظر آتا تھا اور غلام پر ظلم کرنے پر بھی سخت عتاب ہوتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں مختلف مسندوں پر بہت سی جگہوں میں آزاد لوگوں کی بجائے غلام یا ان کے بیٹے نظر آتے ہیں، یہ وہ دور تھا جس میں عربی یا علاقائی عصبیت کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیا گیا، حاکم مصر عمرو بن العاص کے بیٹے نے جب ایک مصری بدو کو کوڑا مارا اور اپنے دادا پر فخر کیا تو حضرت عمرؓ نے مصری کو ان سے بدلہ لینے کا حکم دیا اور عمرو بن العاص سے کہا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا حالانکہ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا ہے۔ لیکن افسوس کہ اسکے بعد امت مسلمہ میں بھی طبقاتی نظام پیدا ہو گیا اور آج تک حالت یہی ہے، آج امت مسلمہ میں وہی قدیم عصبیت جاگ چکی ہے ایران اپنی قدیم تہذیب کی بات کرتا ہے تو یمن اپنی، سعودی عرب، مصر، عراق اور ترک سبھی کا تو یہی حال ہے، امت مسلمہ ہونے کا خیال کسی کے ذہن میں بھی نہیں آتا ہے، اسلام کا نظام مساوات آج کہیں بھی تسلیم نہیں ہے۔

آج جب ایک شخص بڑے بڑے عرب شہروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور سر شرم سے جھک جاتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف ایسا آدمی ہے جس کو اپنی ضرورت سے زائد غذا لباس کا مصرف نظر نہیں آتا دوسری طرف اس کی نگاہ ایسے بدوی پر پڑتی ہے جس کو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کے لئے کپڑے بھی نصیب نہیں۔ جب تک قدیم ایران اور روم والا طبقاتی نظام ہم میں ختم نہیں ہوتا تب تک ہماری ترقی اور عروج کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ٹیکسوں کا بدترین نظام:

جب حکمران عیاشیوں اور فضول خرچیوں میں پڑے ہوں، اثر افیہ ان کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں تو لازمی بات ہے عوام پر بدترین اور ناقابل اداء ٹیکسوں کی بھرمار کر دی جاتی ہے، ان کو انسان کی بجائے جانور اور کولہو کا بیل سمجھا جاتا ہے جس کا کام دوسروں کی عیاشیوں، مستیوں اور فضول خرچیوں کے لئے کام کرنا ہوتا ہے۔ جب حالات یہاں تک پہنچ جائیں تو عوام حکمرانوں سے بدظن اور نالاں ہو جاتے ہیں اور ملکی حکمرانوں کی بجائے بدیسی حکومتوں کو ترجیح دیتے ہیں، تاجر ایسی جگہ سرمایہ کاری چھوڑ دیتے ہیں ملکی اشیاء مہنگی ہونے کے سبب دوسرے ان کو نہیں خریدتے ہیں نتیجہ ریاست والا اقتصادى موت مرتی ہے اور پھر بدترین بد نظمی کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

اسلام سے پہلے کی متمدن قوموں کا حال یہی تھا، روم میں حالت یہ تھی اکثر ٹیکس اداء کرنے کیلئے لوگ اپنے بچوں کو بیچ دیا کرتے تھے، مظالم کی زیادتی تھی، غلام بنانے اور بیگار لینے کا رواج عام تھا، شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کا ٹیکس اداء کرے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور راس المال کا ٹیکس اداء کرے،

فی کس بھی ایک رقم مقرر تھی جس کا اداء کرنا ضروری تھا، اسکے علاوہ رومی قوم کے کچھ دوسرے اہم ذرائع آمدنی تھے مثلاً چنگی، کانیں حاصل وغیرہ۔ ایران میں بھی حالت یہی تھی، نت نئے ٹیکسوں کی وجہ سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی، تجارتنگ تھے، انتشار و بد امنی عروج پر تھی، محصلین و عمال اپنے لئے رقم الگ لیتے تھے، بادشاہ کا حصہ الگ ہوتا تھا اور ریاست کا ٹیکس الگ ہوتا تھا، اور یہ سب دستور کا حصہ تھا، عید نوروز اور مہرگان کے موقعوں پر لوگوں سے جبراً تحائف وصول کیے جاتے تھے۔

ایران و روم کے اس نظام کے خلاف آپ ﷺ نے زکاۃ کا نظام متعارف کروایا جو کہ ہر امیر شخص سے بلا تفریق لی جاتی تھی اور جس علاقے سے لی جاتی تھی انہی پر خرچ کی جاتی تھی، اور اپنی ذات اور خاندان پر ان رقموں کو حرام قرار دیا، عمال کو ظلم سے بچنے کی بہت زیادہ تاکید کی اور ناجائز یا زائد ٹیکس وصول کرنے سے سختی سے منع فرمایا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے آپ ﷺ کی ان قیمتی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا اور آج تمام اسلامی ممالک میں وہی روم اور ایران والے حالات ہیں۔

بگڑتی ہوئی اخلاقیات کا سیلاب:

اخلاقی پستی بھی قوموں کے تنزل کا ایک بڑا سبب ہے اور یہ بہت جلد اقوام کو غالب سے مغلوب بنا ڈالتی ہے، جب بادشاہ خود عیاش اور فضول خرچ ہوں، رعایا کے اخلاق اور انکی تربیت و اصلاح کو نظر انداز کر دیں تو قوموں کے اخلاق عیاشی سے آگے بڑھ کر اس قدر بگڑتے ہیں کہ وہ طبعی اور فطری قوانین کی خلاف ورزی پر اتر آتی ہیں، رومن سلطنت میں اخلاقی پستی اور در ماندگی کی حالت یہ تھی کہ اخلاقی گراؤ اپنی پست ترین سطح پر پہنچ چکی تھی، سب کے دل میں ایک ہی لگن تھی کہ جس طرح ممکن ہو زیادہ سے زیادہ مال سمیٹا جائے اور اس کو فیشن پرستی، عیش پسندی اور اپنی من

مافی خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے، انسانیت و شرافت کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل چکی تیں، تہذیب و اخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ ازدواجی زندگی پر تجرد کو ترجیح دیتے تھے تاکہ آزادی سے انہیں کھیل کھیلنے کا موقع ملے، فسق و فجور کی تحریک شہروں کے اندر اپنے پورے جوش و تلاطم پر تھی اخلاقیات میں پستی و رکاکت حد درجہ سرایت کر گئی تھی دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی، دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھیٹروں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ شہروں میں جو کثیر التعداد زہاد و راہبین پیدا ہوئے تھے وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بد چلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی، غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔

لوگ دعاؤں اور کفاروں سے معافی کی امید پر بے دھڑک گناہ کرتے تھے، مکاری، دغا بازی اور دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ ایران اخلاقی گراؤ میں روم سے کہیں آگے تھا، وہاں کی اخلاقی بنیادیں زمانہ دراز سے متزلزل چلی آرہی تھیں، جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے متمدن و معتدل علاقوں کے باشندے ہمیشہ سے ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں اور فطری طور پر ان سے نفرت کرتے ہیں، ایرانیوں کو ان کی حرمت و کراہت مسلم نہ تھی، یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کر دیا، بہرام چوبیں جو چھٹی صدی میں حکمران تھانے اپنی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا۔

اس فعل شنیع و قبیح کو ناجائز سمجھنا تو درکنار اسکو کار ثواب سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد ایران میں مزدکیت کا دور دورہ ہوا تو مزدک نے عورت اور مال مثل آگ، پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کر دیا شاہ ایران قباز نے اس کی سرپرستی کی اور اس کی تحریک کی اشاعت و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک آگ کی طرح ملک میں پھیل گئی، پورے کا پورا ایران جنسی انار کی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا، نتیجہ باپ اپنے لڑکوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکے اپنے باپ کو، کسی کا کسی ملکیت پر قبضہ و اختیار نہیں رہا تھا۔ ہندوستان میں اخلاقی بحران اور جنسی انار کی کوئڈ ہی تقدس کا درجہ حاصل تھا، دیویوں اور دیوتاؤں کی طرف ایسی روایات منسوب کر کے سنائی جاتی تھیں جن کو سن کر آنکھیں نیچی اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، مخصوص مذہبی فرقوں میں مرد برہمنہ عورتوں کی اور عورتیں برہمنہ مردوں کی پرستش کرتی تھیں۔

مندروں کے محافظ و منتظم بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے، بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم کا مرکز تھیں، راجاؤں کے محل اور بادشاہاؤں کے دربار میں بے تکلف شراب کا دور چلتا تھا اور سرمستی میں اخلاقی حدود برقرار نہ رہتے۔ عربوں میں بھی تمام اخلاقی برائیاں کم و بیش موجود تھیں، شراب ان کی گھٹی میں داخل تھی، شراب پی کر جو اکیلا کرتے تھے اور سب کچھ داؤ پر لگا دیا کرتے تھے، ہار جانے کی صورت میں جنگوں تک کی نوبت آ جاتی، سودی لین دین اور زنا عام تھا۔

حضور اکرم ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا اس میں ایمان کے ساتھ اخلاق کی بھی تربیت فرمائی تھی، آپ ﷺ کے تربیت یافتہ افراد حکومت اور قیادت کے منصب پر مستحکم اخلاقی تربیت اور مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے، انہوں نے دنیا کے عام حکمرانوں کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب و نقائص کے ساتھ پستی سے

بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الہی ان کی اصلاح و تربیت کرتی رہی اور ساٹھ سال وہ رسول اللہ ﷺ کی کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے۔ آپ نے ان کی تربیت و تزکیہ فرمایا، زہد و ورع کی زندگی کا انکو خوگر کیا، حکومت و مناصب کی حرص و طمع ان کے دلوں سے بالکل غائب کر دی، ترفع، ذاتی سر بلندی اور اعزاز کا شوق اور فتنہ و فساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے۔ وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ دار نہیں گرتے تھے بلکہ اس کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے، لیکن جب کوئی قبول کر لیتا تو اس کو مال غنیمت یا لقمہ تر نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو اپنے اوپر ذمہ، امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے تھے۔

خانہ جنگیاں اور نا اتفاقیوں :

کوئی بھی ریاست مسلسل جنگوں کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ جنگوں سے نظام معیشت و معاشرت تباہ ہو جاتا ہے اور بہت سے اہل لوگ ان جنگوں کی نظر ہو جاتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے یہ جنگیں اگر کسی بیرونی دشمن سے نہ ہوں بلکہ ریاست کے اندر ہی ایک گروہ کی دوسرے گروہ کے ساتھ ہوں تو ان کا نقصان دو چند اور ناقابل تلافی ہو جاتا ہے، خانہ جنگیوں میں ریاست کو اپنا وجود سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اگر یہ خانہ جنگیاں شدت اختیار کر جائیں اور مسلسل و پیہم ہوتی رہیں تو ریاست لازمی طور پر کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔

روم اور ایران آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جنگوں میں رہتے تھے کبھی ایک غلبہ پالیتا تو کبھی دوسرا، ریاست کی توجہ مسلسل جنگوں کی طرف رہتی تھی نتیجہ دوسرے شعبوں تعلیم، صحت، معاش اور صنعت میں ریاست کی خاطر خواہ توجہ نہ رہی اور ان میں معیاری ترقی نہ ہو سکی، ایک دوسرے کے ساتھ جنگوں کے

ساتھ ان کی ریاستوں میں بھی مسلسل خانہ جنگیاں جاری رہتی تھیں جو کہ ریاست کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں، روم کے اندر خانہ جنگیاں ہلکے پھلکے کلامی مسائل سے پیدا ہوئیں لیکن جب مذہبی پیشوا اور ریاست خود ان میں کود پڑی تو عیسائیت دو فرقوں میں بٹ گئی، ایک روم و شام کے ماکانی تھے اور دوسرے مصر کے مینوفیٹ، ان دونوں میں ایسی کشاکش بڑھی کہ ایک دوسرے کو سخت سے سخت سزائیں دی گئیں، ریاست و سلاطین کے اس کے اندر داخل ہونے سے فساد دوچند ہوئے، شاہ وقت نے اول فرقہ کی سرپرستی کی اور ریاست میں لاکھوں لوگوں کا خون بہا۔ روم و ایران میں طبقہ وارانہ نظام کے رد عمل میں بھی مسلسل خانہ جنگیاں جاری رہتی تھیں جن کی وجہ سے ریاست کمزور ہوتی چلی گئی۔

ہندوستان میں بھی چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم ریاستیں تھیں جو سیاسی اور حربی حیثیت سے ایک دوسرے پر فوقیت کے لئے جد و جہد میں مصروف رہتی تھیں۔ عربوں کی مسلسل خانہ جنگیاں تو ضرب المثل ہیں چھوٹی چھوٹی سی بات پر طویل خانہ جنگیاں ان کا روزمرہ کا معمول تھا، جنگ بعاث، بسوس اور فجار وغیرہ انہی خانہ جنگیوں کی خون آشام داستانیں ہیں۔

آپ ﷺ نے سبھی کو متحد کر دیا اور آپس میں بھائی بھائی بنا دیا، اتفاق و اتحاد کی بدولت ہی انہوں نے نصف دنیا پر حکمرانی کی۔ اتفاق اور اتحاد کی اہمیت کے پیش نظر آپ ﷺ نے اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اس پر زور دیا ”میرے بعد کفر پر نہ لوٹ جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارتے پھرو“۔ عرب ایک عرصہ تک ایک دوسرے کے بھائی بھائی رہے لیکن پھر رفتہ رفتہ پرانی رقابتیں جاگ پڑیں اور دوبارہ آپس کی خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، نہ خانہ جنگیاں کبھی بنو ہاشم

اور بنو امیہ کے درمیان ہوئیں اور کبھی بنو عباس اور بنو امیہ کے درمیان، ان خانہ جنگیوں کے زمانہ میں نہ صرف اسلام کی اشاعت اور فتوحات کا سلسلہ رکا بلکہ اسلامی ریاست بھی انتہائی کمزور پڑ گئی۔

بنو عباس اور بنو امیہ کے ادوار حکومت میں تخت شاہی کے لئے شہزادوں کی رسہ کشی کی بھی بھینک اور افسوسناک طویل داستانیں ہیں، آپس کے انتشار اور خانہ جنگیوں سے جب ریاستیں کمزور ہوئیں تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سی ذیلی حکومتوں نے سر اٹھالیا اور مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔

ان میں سے بنو عباس کے دور میں سامانی حکومت، بنو بویہ، سلطنت فاطمیہ اور مملوک بادشاہوں کی حکومتوں نے شہرت حاصل کی۔ ان سلطنتوں کی طرح دیگر مشہور سلطنتیں بھی خانہ جنگیوں کے باعث رو بہ زوال ہوئیں، صلیبی جنگوں کے مشہور ہیر و صلاح الدین ایوبی کی سلطنت ان کے تین بیٹوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے تباہی اور خاتمے کا شکار ہوئی۔

اندلس میں مسلمانوں کی پر شکوہ حکومت جو کہ بنو امیہ کے ایک شہزادے عبدالرحمن نے قائم کی تھی کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا شاہی خاندان کے لوگوں نے جب تخت شاہی کے لئے لڑائیاں جھگڑے شروع کئے تو ہر طرف بد امنی پھیل گئی اور خطہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا اور اس کے مختلف حصوں میں کئی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، نتیجہ ایسے زوال کی صورت میں نکلا کہ آج وہاں اس عہد کی چند عمارتوں کے سوا ایک مسلمان بھی نہیں بچا۔ ہندوستان میں مغلوں کی ایک طویل اور وسیع و عریض حکومت پر زوال بھی اسی طرح آیا، اور نگزیب عالمگیر کے بعد اس کے بیٹوں میں ایسی لڑائیاں ہوئیں کہ جنہوں نے مغلیہ حکومت کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لاکھڑا کیا اور

انگریزوں کا ایک دھکے اور معمولی فوج ہی ان کو تباہی و بربادی کی پر خار وادیوں میں اتارنے کے لئے کافی ہوئی۔

عالم اسلام کی موجودہ پستی میں عالم اسلام کی نا اتفاقیوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، عالم اسلام کے اکثر ممالک ایک طویل عرصہ سے خانہ جنگیوں کا بھی شکار ہیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے مسلسل لڑ رہے ہیں، مثلاً ایک لمبے عرصے تک انڈونیشیا اور ملائیشیا کا آپس میں قضیہ چلتا رہا، یمن خانہ جنگی کا شکار رہا اور اس میں طویل عرصہ مصر اور سعودی عرب کے فوجی آپس میں لڑتے رہے اور اب اسی مصر میں سعودی عرب اور ایران کے فوجی لڑ رہے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں طرفین کے فوجی انہی جنگوں کی نظر ہو چکے ہیں عوام کا جو خون بہاوا لگ ہے۔

شام میں ایک لمبے عرصے تک حکومت اور اخوان المسلمون کے درمیان مسلح جنگ رہی، اور اب بھی کئی طاقتیں شام میں برسرِ پیکار ہیں، عراق میں صدام انتظامیہ نے اپنے سیاسی مخالفین اور علیحدگی پسندوں کے خلاف قتل و غارت کا بازار گرم کئے رکھا، اور ابھی بھی عراق میں خانہ جنگی جاری ہے۔

الجزائر میں ۱۹۹۱ء کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں عراق نے ایران پر حملہ کر دیا جس میں طرفین کے ۱۰ لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے، اس کے بعد عراق نے کویت پر حملہ کیا، اور آج کل ایران کی مختلف اسلامی ممالک میں دخل اندازی سے نئی جنگوں کی صورت حال بنی ہوئی ہے۔

نظام حکومت کے مستحکم اصول و قوانین:

کسی بھی سلطنت اور ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے مستحکم اصولوں کا

ہونا از حد ضروری ہے، اگر اصول و ضوابط مستحکم نہ ہوں تو تمدن کی تعمیر محال ہے اور نظام سلطنت نہیں چل سکتا ہے نتیجہ یا تو یہ قوم دوسروں کی دست نگر اور محتاج بن کر رہ جاتی ہے اور دوسروں کے قوانین و نظام کو اپنے ہاں نافذ کرتی ہے یا ایک ناکام تمدن کو تشکیل دیتی ہے جو جلد ہی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلام سے قبل روم اور ایران متمدن قومیں شمار ہوتی تھیں لیکن انکا قانونی نظام انسانیت کو اپنے ساتھ نہیں لے کر چل سکا، روم میں عیسائیت تھی اور مسیحی مذہب میں کبھی بھی اس درجہ وضاحت نہ تھی کہ جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جائیں، جو کچھ تھا وہ صرف حضرت مسیح کی تعلیمات کا ہلکا سا خاکہ تھا جس پر توحید کے سادہ عقیدہ کا کچھ پر تو تھا، مسیحیت کا یہ امتیاز بھی اس وقت تک قائم رہا جب تک یہ مذہب سینٹ پال کی دست اندازی سے بچا رہا، سینٹ پال نے آکر رہی سہی روشنی بھی گل کر دی، اس کی تربیت بت پرستی کے ماحول میں ہوئی تھی، جاہلی خرافات سے نکل کر وہ آیا تھا، اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کر دی، اس کے بعد قسطنطین نے اپنے دور حکومت میں رہی سہی کسر بھی نکال دی۔

غرض یہ کہ چوتھی صدی عیسوی میں ہی عیسائیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی جس میں یونانی خرافات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت اور رہبانیت کے اجزاء شامل تھے، مسیحیت اس دور میں چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام بن کر رہ گئی تھی، جو روح میں گداز پیدا کر سکتے تھے نہ عقل کی افراش کا سبب بن سکتے تھے، ان میں صلاحیت نہ تھی کہ زندگی کے اہم مسائل میں انسانی قافلے کی راہ نمائی کر سکیں، اسی لئے جب لوگوں نے ترقی کی تو عیسائیت کے بنائے ہوئے قوانین زمانے کی ترقی کا ساتھ نہ دے سکے۔

اس دور کی دوسری متمدن قوت ایرانی تھے، ایرانی آگ کی پوجا کرتے تھے اور آگ اپنے پجاریوں کو ہدایت دینے اور اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ ان کے مسائل زندگی کو حل کر سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مجوسی مذہب چند مراسم و روایات کا نام رہ گیا تھا جن کو مخصوص اوقات اور خاص مقامات میں وہ اداء کر لیا کرتے تھے باقی ہر جگہ پر وہ آزاد تھے، نتیجہ اخلاق بگڑے ہوئے تھے، ظلم و ستم عام تھا اور ہر جگہ نفسانی خواہشات کی پیروی تھی۔

ہندوستان میں بھی صورتحال ایسی ہی تھی، ان کے پاس عرصہ دراز سے قانون نام کی کوئی چیز نہ تھی، تین سو قبل مسیح میں منوجی نے منو شاستر کے نام سے قوانین کا ایک مجموعہ تیار کیا جو ملکی قانون اور مذہبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ منو جی کے قوانین کی کمزوری اور عدم استحکام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ طبقہ واریت کا نظام منوجی نے ہی دیا تھا، اس قانونی کتاب میں بت پرستی کو بھی قانونی حیثیت حاصل تھی اور عورت کی کمزور حیثیت کو بھی۔

غرض ہندوستان بھی سچے آسمانی مذہب کی تعلیمات سے محروم ہونے اور مذہبی مستند ماخذ کم ہو جانے کی وجہ سے قیاسات و تحریفات کا شکار اور رسوم و روایات کا پرستار بنا ہوا تھا، اور اس وقت کی دنیا میں جہالت، توہم پرستی، پست درجہ کی بت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ واری نا انصافی میں پیش پیش تھا، دنیا کی اخلاقی و روحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی اور اخلاقی بد نظمی میں مبتلا تھا۔

بودھ مت بھی اس زمانے کا ایک بڑا مذہب تھا جو چین اور اسکے ارد گرد کے ممالک میں رائج تھا، لیکن بدھ مت نے بھی خود کو برہمنیت میں ضم کر دیا تھا اور گوتم بدھ کی سادہ آسمانی تعلیمات الہیاتی موٹو گانیوں کے نیچے دب کر رہ گئیں، اکثر متبذل

رسوم ان میں داخل ہو گئیں تھیں، ان کے پاس دنیا کے لئے کوئی پیغام نہ تھا جس کی روشنی میں دنیا اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتی، اور خدا کا راستہ پاتی۔

رسول اللہ نے مسلمانوں کو کتاب اور الہی شریعت دی جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں، شریعت کے یہ قوانین آسان، سہل، معقول اور ممکن العمل تھے، یہ روحانیت و مادیت کا حسین امتزاج تھے، ان میں نہ تو دین کی نفی تھی نہ دنیا کی، یہ قوانین اپنے پرائے، امیر اور غریب سبھی کے لئے یکساں اور قابل تھے، مسلمانوں نے انہی قوانین کی روشنی میں نصف دنیا میں حکومت کی اور دنیا بھر کی اقوام اس کی روشنی میں اکٹھی ہو گئیں، اس سے اس قانون کی آفاقیت اور عالمگیریت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے، لیکن مسلمانوں نے جب ان مستحکم اصولوں کی چھوڑ دیا تو رو بہ زوال ہوئے۔

صنعت و حرفت اور جدید دفاعی نظام:

صنعت و حرفت اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کسی بھی قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے اور اسکے اقتدار کو وسیع و عریض اور مضبوط بناتی ہے۔ مسلمانوں کو قرآن کریم میں یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو ان کی دسترس میں ہو، ”اور جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کرو اور گھوڑے تیار رکھو“ الانفال ۶۰۔

چنانچہ اس وقت رائج تمام ہتھیاروں پر مسلمانوں کو مکمل دسترس تھی، اس وقت کے جدید ہتھیار منجبتی اور دبابہ وغیرہ بھی مسلمانوں نے استعمال کیے۔ اس کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کی حکومتیں اپنی تمام تر خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود صنعت و حرفت اور جدید ٹیکنالوجی میں ترقی کے باعث طویل عرصہ تک چلتی رہیں۔

بنو امیہ نے فوج کی طرف بھرپور توجہ دی، اس وقت مسلمان آسانی کے ساتھ دولاکھ فوج بلکہ اس سے بھی زیادہ بیک وقت میدان جنگ میں لاسکتے تھے، اسلحہ اور فوجی تنظیم بہت بہتر تھی، اس زمانے کی بری و بحری قوت میں مسلمانوں کو غلبہ اور تفوق حاصل تھا، شام، مصر اور تیونس میں جہاز سازی کے کارخانے تھے جنہیں دار الصنائع کہا جاتا تھا، حکومت کے پاس ہر وقت ہزاروں جنگی جہازوں پر مشتمل بیڑہ تیار رہتا تھا، مروجہ سائنسی علوم کی طرف بھرپور توجہ دی جاتی تھی، مثلاً ایک اموی شہزادہ خالد بن یزید نے یونانیوں سے فلسفہ، طب اور علم کیمیا کی تعلیم حاصل کی اور خود بھی علم کیمیا پر کتابیں لکھیں۔

بنو عباس بھی صنعتی اکتشافات میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے، مشہور کیمیا دان جابر بن حان اسی دور میں تھے اسکے علاوہ متعدد دوائس دان و اہل فن مثلاً موسیٰ خوارزمی، محمد بن زکریا رازی، فارابی، ابن ہشیم اور بوعلی سینا جیسی شخصیات اسی دور میں گزری ہیں، جنہوں نے سائنسی اکتشافات اور فلسفیانہ نظریات میں حکومت کو اس وقت کی دنیا میں نمایاں مقام دلایا۔

اسی طرح ترک جب میدان میں آئے تو اولاً انہوں نے بھی وائسنی اکتشافات و جدید ہتھیاروں میں بہت ترقی کی جس کی بدولت وہ ایک تادیر حکومت کی بنیاد رکھ سکے۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس کے لئے لمبا عرصہ تیاری کر تا رہا، اس کے زمانہ میں علم کی جتنی طاقت تھی اس سے کام لیتا رہا، توپیں اس وقت نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں، اس نے کوشش کی کہ جتنی زبردست اور بڑی توپیں بن سکتی ہیں بنائی جائیں، اس نے اس کے لئے ہنگری کے ایک انجینئر کی خدمات حاصل کیں جس نے اس کے لئے ایک ایسی توپ بنائی جو تین سو کلو وزن کا گولہ پھینکتی تھی اور اس کی مار

ایک میل سے زیادہ تھی، اس توپ کو کھینچنے کے لئے سات سو آدمیوں کی ضرورت تھی اس کو بھرنے کے لئے دو گھنٹے چاہیے تھے، اس وقت اس کی فوج میں تین لاکھ سپاہی، زبردست توپ خانہ اور بحری بیڑہ جو کہ ایک سو بیس کشتیوں پر مشتمل تھا۔

لیکن اس کے بعد ترکوں میں جمود نے جگہ لے لی، علم و صنعت میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سولہویں صدی مسیحی سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع ہی نہیں ہوئی تھی، اٹھارہویں صدی میں ترکی پر پریس، مطابع، حفظان صحت کے مراکز اور فوجی تعلیم کے لئے جدید طرز کے مدارس سے روشناس ہوا، اور اس وقت تک ترکی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دارالسلطنت پر ایک غبارہ کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیکل کی کرشمہ سازی سمجھے۔

۱۷۳۷ء میں استنبول میں اسلامی دنیا کا پہلا چھاپہ خانہ قائم ہوا لیکن مفتی اعظم نے اس شرط پر قائم کرنے کی اجازت دی کہ اس میں قرآن کریم اور دینی کتابوں کی اشاعت نہ ہوگی، کیونکہ مفتی صاحب کے خیال میں چھاپہ خانہ بنیادی طور پر ایک شیطانی مشین کی حیثیت رکھتا تھا، اس مکمل دور زوال کو سلیم ثالث نے روکنے کی بہت کوشش کی، اس نے تعلیم اور جدید سائنسی علوم کی طرف توجہ دی، انجینئرنگ کالج قائم کیے جن میں وہ خود تعلیم دیتا تھا۔

اس نے جنگی فنون سے متعلق یورپی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور فرانسیسی انجینئروں کی مدد سے توپ ڈھالنے کے جدید طرز کے کارخانے بھی قائم کئے، سیاسی نظام میں بھی تبدیلیاں کی اور جاگیر دارانہ نظام کو ختم کیا، اس وقت کے علماء نے ان سب اصلاحات کی مذہب کے نام پر مخالفت کی، بالآخر شیخ الاسلام کے فتوے پر

۱۸۰۷ء میں سلطان سلیم کو معزول کر کے قتل کر ڈالا گیا۔

اس کے بعد ترکی نے ترقی کی طرف کچھ قدم اٹھائے لیکن مغربی دنیا کے مقابلے میں یہ بہت پیچھے تھے۔ مغل حکمرانوں نے بھی عمارتوں اور باغات کی طرف بہت توجہ دی لیکن سائنسی ترقی کے اعتبار سے یہ پورا دور مکمل طور پر ناقابل ذکر ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انگریزوں اور اہل یورپ نے اس وقت تک جو ترقی کر لی تھی مسلمان اس کے عشر عشر بھی نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخلصانہ جذبات و کوششیں انگریز کے سامنے ناکام ہوتی گئیں، سراج الدولہ کی ستر ہزار فوج کو انگریز کی صرف تین ہزار فوج نے عسکری تنظیم اور جدید ہتھیاروں کی بدولت شکست دی۔

اسی طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کی وجہ بھی یہی تھی، اور آج بھی ہماری حالت یہی ہے ان تین صدیوں میں ہم نے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے، آج بھی سوائے ملائیشیا کے کسی اسلامی ملک کی کوئی خاص صنعت نہیں ہے، دفاعی اعتبار سے صرف پاکستان کے پاس نیوکلیر ٹیکنالوجی موجود ہے، ہوائی جہاز، ٹینک، توپ، آب دوز، بحری جہاز، ریڈار، بکتر بند گاڑیاں اور اس نوعیت کی دیگر تمام چیزوں کے لئے مسلمان دوسروں کے محتاج ہیں پچھلے کئی سو برس میں کسی مسلمان ملک میں کوئی نئی ایجاد نہیں ہوئی۔

تعلیم و تعلم میں پیچھے رہ جانا:

قوموں کی ترقی، خوشحالی و فارغ البالی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں تعلیم عام ہو، رسول اللہ نے اپنے انقلاب کی بنیاد ایمان، اخلاقیات کے ساتھ تعلیم پر بھی رکھی، آپ کے دور کا ہر فرد تعلیم یافتہ تھا۔ تعلیمی میدان میں مسلمان صدیوں تک

دنیا سے ممتاز و فائق رہے، ان کے تعلیمی ادارے دنیا بھر میں علم و عرفان کی روشنی پھیلاتے رہے، بنو امیہ اور عباس بہت سی چیزوں میں گر چکے تھے لیکن تعلیم و تعلم کا نظام علمی شخصیات کے سبب ترقی یافتہ تھا۔

بنو امیہ کے دور حکومت میں امام زین العابدین، امام باقر، جعفر صادق، سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، حسن بصری، مجاہد بن جبیر، شعبی، قتادہ، مکحول، یزید بن حبیب، حماد اور عیسیٰ بن عمر جیسی علمی شخصیات اور اساطین علم نے امت کی علمی و فکری قیادت کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا، بنو عباس کے دور حکومت میں بھی بڑے بڑے صاحب علم و فن پیدا ہوئے جنہوں نے حکومتوں سے تعرض کئے بغیر معاشرے کی علمی تعمیر و ترقی میں اپنا عظیم کردار ادا کیا۔ فقہ کے ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل نے اپنے کارنامے اسی دور میں سر انجام دیے، احادیث کے چھ بنیادی مجموعے اسی دور میں لکھے گئے، موطا امام مالک اسی دور میں لکھی گئی۔

ابن ہشام نے سیرت النبی لکھی، ابن سعد نے طبقات ابن سعد لکھی، بلاذری نے فتوح البلدان تحریر کی اور ابن جریر نے چودہ جلدوں پر مشتمل تاریخ اسلام لکھی، اسی دور میں مشہور جغرافیہ دان مسعودی نے اپنی تحقیقات پیش کیں۔

ابو الحسن علی اشعری نے عقلی بنیادوں پر اسلامی نظریات کی صداقت ثابت کی، آٹھویں صدی ہجری تک مسلم اساطین علم اپنے علم و فن کی داد وصول کرتے رہے، آٹھویں صدی کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا، اس کے بعد نویں صدی میں خال خال ایسی علمی شخصیات نظر آتی ہیں۔ دسویں صدی میں تو واضح طور پر افسردگی، شدت، نقالی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، اسکے بعد سینکڑوں ناموں میں سے ایک شخص کا ملنا مشکل ہو گا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو، ستم بالا یہ کہ انیسویں اور بیسویں

صدی میں بھی اسلامی مدارس کا وہی رنگ رہا جو تیرہویں صدی میں تھا۔

ایک شبہ اور اسکا ازالہ:

یہاں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ زوال کے تمام اسباب نہ صحیح اکثر تو یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ اقوام میں بھی پائے جاتے ہیں تو ان پر زوال کیوں نہیں آ رہا، اس شبہ کا ایک حل تو یہ ہے کہ زوال اس طرح نہیں آتا کہ رات کو سوؤ اور صبح زوال آجائے۔

قوموں کے عروج و زوال کا دائرہ کار برسوں یا اس سے بھی بڑھ کر صدیوں پر محیط ہوتا ہے، مسلمانوں کی مشہور سلطنتیں بنو عباس، اندلس میں بنو امیہ، ترکوں اور مغلوں وغیرہ میں ابتدائی ڈیڑھ دو سو سال کے بعد زوال کی علامات بہت حد تک پائی جاتی تھیں لیکن ان کے زوال اور دوسروں کے ان پر غلبہ میں مزید کئی صدیاں گزر گئیں، دوسرا حل یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسی طاقت ور قوم یا جماعت جو ان مغربی قوموں سے عقائد و نظریات کا اختلاف رکھتی ہو، اور ان کے جاہلی فلسفہ اور مادی نظام زندگی کی مخالف ہو منظر عام پر نہیں ہے، ایسی قوم یا جماعت اس وقت نہ یورپ میں پائی جاتی ہے، نہ افریقہ اور ایشیا میں۔

یورپ کے جرمن ہوں، یا ایشیا کے جاپانی یا ہندوستان کے باشندے سب اس جاہلی فلسفہ اور اس مادہ پرستانہ نظام حیات کے قائل و معتمد ہیں، یا ہوتے جا رہے ہیں، دوسرے لفظوں میں یورپ و امریکہ کی تہذیب سے دنیا بھر کی اقوام اور مذاہب متاثر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان سے اقتدار چھن جائے اور ان کو مل جائے۔

مسلمانوں کے لئے لائحہ عمل:

جاہلیت آج دنیا کو جس نقشہ پر چلا رہی ہے اس کے خلاف اگر کوئی نقشہ ہے

تو صرف مسلمانوں کے پاس ہے، کیونکہ مسلمانوں کے پاس دینی سرمایہ اور آسمانی ہدایت و حکمت کا سرچشمہ محفوظ ہے، اس لئے مسلمان اگر آج بھی بیدار ہوں اور اپنے فرض منصبی کو پہچانیں تو یہ ساری دنیا پر غلبہ پاسکتے ہیں اس کے لئے صرف چند کام کرنے ہوں گے، سب سے پہلے تو ایمان کی تجدید کرنا ہوگی اور اسی اعتقاد و یقین کو پیدا کرنا ہوگا جو صحابہ کی زندگیوں میں تھا۔ اس کے بعد روحانیت کی سطح کو بلند کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ مادیت میں سر و پا ڈوبے ہوئے یورپ کا مقابلہ مادیت سے نہیں بلکہ اس چیز سے ہوگا جو اس کے پاس موجود نہیں ہے اور وہ روحانیت ہے۔

ایمان و روحانیت کے بعد ہمیں اپنے شعور کی تربیت بھی کرنا ہوگی، مسلم ممالک بیداری اور شعور سے بالکل محروم ہیں، ان کے شعور کی کمزوری ہے کہ خیر خواہ اور بد خواہ کے ساتھ ان کا معاملہ تقریباً یکساں ہے، بلکہ بعض اوقات بد خواہ اور غیر مخلص اشخاص مسلمانوں میں زیادہ ہر دل عزیز اور معتمد بن جاتے ہیں۔

مسلمان آج غالب قوموں اور خود غرض رہنماؤں کا بازیچہ اطفال بنے ہوئے ہیں، آسانی کے ساتھ ان کا رخ ہر طرف موڑا جاسکتا ہے، حکومتیں ان کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتی رہتی ہیں اور جس طرف چاہتی ہیں ایک لاشی سے ہانک لے جاتی ہیں، ہمارے اندر سیاسی شعور کی ایسی پختگی ہونی چاہئے کہ ہم ہر خود غرض، عیاش، نااہل اور فضول خرچ حکمران کا احتساب کر سکیں۔

مزید برآں ہمیں علم، صنعت و حرمت، جدید ٹیکنالوجی اور جنگی نظام کو بھی اچھی طرح سمجھنا ہوگا تب کہیں ہمارے عروج اور مغرب کے زوال کا آغاز ہوگا، ورنہ مغرب مغلوب تو ہوگا لیکن ہمارے ہاتھوں نہیں بلکہ کسی اور طاقت کے ذریعے۔

غزہ: دنیا کا سب سے بڑا غیر قانونی قید خانہ

مولانا خورشید عالم داؤد قاسمی

آج کی تاریخ میں دنیا کا اگر کوئی سب سے بڑا غیر قانونی قید خانہ ہے؛ تو وہ فلسطین کا مشہور خطہ "غزہ کی پٹی" ہے۔ اسرائیل کی دہشت گردی اور پڑوسی ملک مصر کی غیر دانشمندانہ حکمت عملی کے سبب، غزہ دنیا کے سب سے بڑے غیر قانونی قید خانے اور آہنی پنجرے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ غزہ پٹی 365 کیلو میٹر کے رقبہ پر مشتمل بچے کچھے فلسطین کا ایک اہم خطہ ہے۔ غزہ پٹی کی آبادی تقریباً دو ملین لوگوں پر مشتمل ہے۔ یاسر عرفات کی وفات کے بعد، منعقد ہونے والے الیکشن میں "حماس" (اسلامی تحریک مزاحمت) کی کامیابی کے بعد، اسماعیل ہنیہ کو فلسطین کا وزیر اعظم منتخب کیا؛ لیکن صدر محمود عباس نے ان کو 2007 میں معزول کر دیا، جس کے بعد مسٹر ہنیہ "غزہ" میں اپنی حکومت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس طرح غزہ کی حکومت جون 2014 تک "حماس" کے کنٹرول میں رہی۔ پھر 2/ جون کو آپسی اتحاد و اتفاق کے بعد، مشترکہ حکومت بنانے کی بات طے ہوئی، مگر اس کا کوئی فائدہ حماس اور اہالیان غزہ کو حاصل نہیں ہوا۔

جہاں ایک طرف اسرائیل نے سن 2007 سے غزہ کی پٹی کا محاصرہ کر رکھا ہے؛ وہیں دوسری طرف مصر نے غزہ بین الاقوامی گزر گاہ "رفح" کی ناکہ بندی کیے ہوئے ہیں۔ غزہ کے محاصرہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسرائیلی حفاظتی دستے صرف غزہ کے باشندوں کی قدم قدم پر جامہ تلاشی لیتے ہیں؛ بل کہ غزہ کی پٹی میں، ہر طرح کی درآمدات پر بھی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اگر کوئی بیمار ہے؛ تو دوسرے ملک علاج کے

لیے بھی نہیں جاسکتا ہے۔ اگر کوئی کہیں تعلیم حاصل کر رہا ہے اور گھر والوں سے ملنے کے لیے کسی طرح غزہ میں داخل ہو جاتا ہے؛ تو دوبارہ اس کا ٹکنا مشکل ہے۔ اسرائیل کے اس ظالمانہ محاصرے اور مصر کی ناکہ بندی کے نتیجے میں، کتنے لوگ علاج و معالجے سے محروم ہو کر، موت کی آغوش میں جا چکے ہیں اور کتنے پڑھنے لکھنے والے تعلیم سے محروم ہو کر غزہ میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسرائیل کے غرور کو اگر کوئی جماعت خاک میں ملا سکتی ہے؛ تو آج کی تاریخ میں وہ واحد جماعت "حماس" ہے اور حماس کی اصل روح غزہ کے باشندگان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دسمبر 2005 میں ہی ایریل شیرون کی حکومت نے غزہ کے باشندگان کو حماس سے متفر کرنے کے لیے غزہ سے بجلی سپلائی ختم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر اس تجویز کو اس لیے عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا کہ اولاً تو یہ عمل بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہوگی اور پوری دنیا اس پر اسرائیل کو تھو تھو کرے گی اور دوسرے یہ کہ اسرائیل کی اس حرکت کا سیدھا نقصان محمود عباس کی "فتح پارٹی" کو الیکشن میں اٹھانا پڑے گا اور حماس حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

جب 2006 کے الیکشن میں، حماس نے جمہوری طریقے سے واضح اکثریت کے ساتھ، الیکشن جیت لیا؛ تو اسی وقت سے غزہ کو ملنے والی امداد کو روکنے کا عمل شروع کر دیا گیا تھا۔ پھر ہوتے ہوتے 2007 سے اسرائیل نے پورے غزہ کا محاصرہ کر کے اسے دنیا کے سب سے بڑے غیر قانونی قید خانے میں تبدیل کر دیا۔

غزہ کی پٹی کے محاصرے کا مقصد یہ ہے کہ جب غزہ کے باشندگان ہر طرف سے پریشانی کا سامنا کریں گے؛ تو وہ حماس کی حکمت عملی اور سرگرمیوں سے ناراض ہو کر، حماس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں گے اور پھر محمود عباس یا اس جیسے کسی نام

نہاد معتدل سیاسی رہنما کی قیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے، جو واضح طور پر اسرائیل کو تسلیم کرے اور اسرائیل کی راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ آج اسرائیل جو کھیل غزہ میں کھیل رہا ہے، وہ باشندگان غزہ کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے اور اسرائیل جہاں اس کا بلا واسطہ مجرم ہے، وہیں بین الاقوامی سماج اس جرم میں بالواسطہ شریک ہے۔

جب ڈاکٹر محمد مرسی مصر کے اقتدار میں آئے، تو انھوں پہلا کام یہ کیا کہ "رفح" گزرگاہ کی ناکہ بندی ختم کی۔ اس سے غزہ والے نے راحت کی سانس لی تھی۔ مگر 3 جولائی 2013 کو، محمد مرسی کی ناجائز گرفتاری کے بعد، پھر سے رفح گزرگاہ کی ناکہ بندی کر دی گئی اور قاہرہ عدالت نے "حماس" کو ایک دہشت پسند تنظیم قرار دے کر، اس کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی۔

غزہ کی پٹی کے محاصرے کا اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون، اقوام متحدہ کی حقوق انسانی کونسل اور حقوق انسانی سے متعلق بہت سے دوسرے اداروں نے "اقوام متحدہ" کے پلیٹ فارم سے، اسرائیل کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے؛ مگر اسرائیل ہے کہ اس کو اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا؛ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اقوام متحدہ میں "ویٹو" پاؤر" سے مسلح ایک ایسا ملک بھی موجود ہے جو کبھی اسرائیل کے مفاد کے خلاف کچھ ہونے نہیں دے گا؛ جہاں تک مذمتی قرارداد کی بات ہے؛ تو اس سے اسرائیل کا کیا بنتا اور بگڑتا ہے۔

اقوام متحدہ کی حقوق انسانی کونسل کے حقائق شناسی مشن نے سن 2009 میں اپنی چھان بین کے بعد، یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ اس محاصرہ نے غزہ کو ایک "اجتماعی قید خانے" میں تبدیل کر دیا ہے جو ناروا اور خلاف قانون ہے۔ اسے فوراً ختم کیا

جانا چاہیے۔ واضح رہے کہ یہ مشن "بین الاقوامی کریمنل کورٹ" (International Criminal Court) کے سابق جج مسٹر چارڈ اور اقوام متحدہ کے پانچ ماہرین حقوق انسانی کے گروپ کی نگرانی میں تحقیق کر رہا تھا۔

ناجائز ریاست اسرائیل اپنے وجود کی بقا کے لیے جو ظلم کر رہی ہے، اس کی سزا اسے ایک دن ضرور مل کر رہے گی۔ مگر اس وقت بڑا افسوس ہوتا ہے جب ایک مسلمان پڑوسی ملک بھی غیروں جیسی حرکت کرنے سے باز نہیں آتا۔ ابھی چند دنوں قبل ترکی کے مرد آہن، رجب طیب اردگان نے اسرائیل اور ترکی تعلقات کی استواری کے حوالے سے اسرائیل کے سامنے تین شرطیں پیش کی تھیں۔ ایک یہ کہ اسرائیل نے سن 2010 میں غزہ کے لیے راحت رسانی کا سامان لے کر جانے والے بحری بیڑے پر حملہ کر کے جو ترکی شہریوں کا قتل کیا تھا، باضابطہ طور پر ترکی سے اس کی معافی مانگے۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں کا قتل ہوا تھا، ان کے اہل خانہ کو معاوضہ دے اور تیسرے یہ کہ "غزہ کی پٹی" کا محاصرہ ختم کرے۔ جوں ہی ترکی کی ان شرائط کا علم مصری انتظامیہ کو ہوا، تو اس نے پہلے دو شرائط کے حوالے سے تو خاموشی اختیار کی؛ مگر تیسری شرط پر آگ بگولہ ہو کر، اسرائیل سے اپنی اس فکر مندی کا اظہار کیا کہ اس طرح ترکی حماس کے تسلط والے خطے غزہ میں اپنا ایک کردار ادا کرنا چاہتا ہے، جو مصر کے مفاد کے خلاف ہے اور مصری انتظامیہ اس حوالے سے فکر مند ہے۔ مصر کی اس حرکت سے کسی بھی اہل ایمان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ ایک مسلمان پڑوسی ملک بھی اس طرح کی باتیں کر سکتا ہے!

جب ایک مصری ارض فلسطین پر قدم رکھتا ہے؛ تو فلسطین کے بھوک پیاس سے بلبلاتے اور بیمار یوں میں مبتلا بچے بوڑھے سب یہ کہتے ہوئے ملتے ہیں کہ مصریوں

کو ہم بھائی سمجھتے ہیں۔ ہم مصر کے مفاد کے خلاف کوئی اقدام نہیں اٹھاتے۔ پھر مصر ہمیں کس غلطی کی سزا دے رہا ہے؟ وہ بڑی عاجزی کے ساتھ مصری انتظامیہ سے درخواست کرتے ہیں کہ رنچ گزر گاہ کی ناکہ بندی کو ختم کر کے، ان کو چین و سکون سے جینے کا موقع فراہم کریں؛ لیکن مصری انتظامیہ سننے کو تیار نہیں۔ یہ وہی مصری انتظامیہ ہے جو پڑوسیوں کے حقوق کے حوالے سے اپنی مساجد کے اماموں اور خطیبوں کو خصوصی لکچرزد لواتی ہے کہ اسرائیل ہمارا پڑوسی ملک ہے اور اسلام نے پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت کی تاکید کی ہے۔ مگر جب فلسطینیوں اور خاص طور غزہ کے باشندگان کی بات آتی ہے، تو وہ پڑوسی کے حقوق سے لاعلم ہو جاتی ہے۔

"مرکز اطلاعات فلسطین" کی رپورٹ کے مطابق ابھی 6/ جنوری 2016

کو فلسطینی اتھارٹی کے سربراہ ابوالمازن محمود عباس نے بیت لحم شہر میں واقع صدارتی دفتر میں، ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مصر کی جانب سے غزہ بین الاقوامی گزر گاہ "رنچ" کی ناکہ بندی کو حق بجانب قرار دیا اور اس کی ذمہ داری حماس جیسی مخلص جماعت کے سر ڈال دیا۔ محمود عباس نے کہا کہ مصر کو رنچ کی گزر گاہ بند کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ عباس نے حماس پر الزام عاید کرتے ہوئے کہا کہ رنچ گزر گاہ کی بندش کی ذمہ دار حماس ہے؛ کیوں کہ حماس کی جانب سے رنچ گزر گاہ کی مانیٹرنگ فلسطینی اتھارٹی کے حوالے نہیں کی گئی، جس پر مصر کے ساتھ بحران پیدا ہوا۔ ان کے اس بیان پر فلسطین میں عوامی اور سیاسی حلقوں کی جانب سے سخت غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ حماس کی جانب سے کہا گیا ہے کہ عباس کے الزام میں کوئی حقانیت نہیں ہے اور وہ فلسطین دشمنی پر مبنی بیانات جاری کر رہے ہیں۔

(مرحوم) یاسر عرفات (1929-2004) کی وفات کے بعد، جب محمود

عباس فلسطین اتھارٹی کا صدر منتخب ہوا؛ تو کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ عباس ایک معتدل شخص ہے۔ اب فلسطین کا مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے گا۔ شاید ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ عباس کو صہیونی میڈیا نے اسرائیل کے مفاد میں "معتدل" ہونے کی سند تفویض کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص کو فلسطین، قدس اور اقصیٰ کے مسائل سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے۔ یہ شخص خود کو ایک قد آور اور اعتدال پسند لیڈر ثابت کرنے کی دھن میں کسی حد تک جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ابولمازن محمود عباس، مجلہ الداعی کے چیف ایڈیٹر مولانا نور عالم خلیل امینی اور مشہور مصری داعی وادیب ڈاکٹر صلاح الدین سلطان وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ کریں۔

بہر حال، غزہ پٹی کے باشندگان کے حوالے سے اسرائیلی انتظامیہ اور اسرائیل کے صہیونیت زدہ باشندے ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں کہ کوئی بھی "انسانیت نواز" شخص اور جس کے سینے میں ایک دھڑکتا دل ہو، خاموش نہیں رہ سکتا۔ غزہ کی پٹی کے محاصرے سے انسانی حقوق کی بہت بڑی پامالی ہو رہی ہے؛ لہذا عالمی طاقتوں کو ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسرائیل سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ غزہ کا محاصرہ ختم کرے اور وہاں رہنے والے انسانوں کو سکون سے جینے کا موقع فراہم کرے۔ جہاں تک مصری انتظامیہ کا تعلق ہے؛ تو اسلامی اخوت، عرب رواداری اور پڑوسی کے حقوق کا خیال کرتے ہوئے اسے غزہ بین الاقوامی گزرگاہ رنج کی ناکہ بندی ختم کرنی چاہیے اور اللہ کے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو پیش نظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ لینا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے نہ اسے (مدد چھوڑ کر دشمنوں کے) حوالے کرے۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرتا ہے، اللہ اس کی حاجت پوری کرتا ہے۔"

برکتہ العصر مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ

مولانا مجیب الرحمن انقلابی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا نام نامی اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ متبحر عالم دین و وسیع النظر شیخ، بلند پایہ محقق اور علم حدیث میں اعلیٰ اور انفرادی شان رکھتے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی عالم اسلام کی وہ عظیم علمی و روحانی شخصیت ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے لاکھوں لوگوں کو ہدایت کا ذریعہ بنایا، عرب و عجم اور یورپ و ایشیاء میں آپ کو یکساں محبوبیت و مقبولیت عطا فرمائی، مختلف علوم و فنون پر دعوتی، تبلیغی، اصلاحی علمی و تحقیقی عنوانات پر آپ کی تصنیفات و تالیفات 100 سے زائد ہیں جو اردو عربی اور فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی شہرہ آفاق تصنیف فضائل اعمال کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقبولیت عطا فرمائی ہے جو کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہو سکی۔ پوری دنیا کے ہر ملک میں مختلف زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والی یہ کتاب انتہائی مقبول ہے، چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت ایسا نہیں گذرتا جس میں یہ کتاب دنیا میں کہیں نہ کہیں پڑھی اور سنی جا رہی ہو اور اس کو اللہ تعالیٰ نے لاکھوں لوگوں کیلئے ہدایت اور نیکی پر چلنے کا ذریعہ بنایا۔ جس طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی سینکڑوں تصنیفات کے باوجود ”بہشتی زیور“ ان کی پہچان اور ہر مسلم گھر کی ضرورت بن گئی۔

مفتی اعظم ہند حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی ”تعلیم الاسلام“ کتاب کو جس طرح مقبولیت ملی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا

کاندھلوی کو مایہ ناز تصنیف فضائل اعمال کے ذریعہ جو شہرت و عزت، ر مقام اور مقبولیت و محبوبیت عطا فرمائی وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہو سکی۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی 1898ء کو ہندوستان کے علاقہ کاندھلہ میں حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کے ہاں پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کا گھرانہ ان خوش قسمت خاندانوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقبولیت و محبوبیت سے خواب نوازا تھا اس خاندان کی بنیاد کچھ ایسے صدق و اخلاص پر پڑی تھی کہ یکے بعد دیگرے، نسل در نسل اس خاندان میں علماء، فضلاء، اہل کمال و علم، مقبولین اور اللہ والے لوگ پیدا ہوتے چلے آ رہے ہیں۔

جس تبلیغی جماعت کی آج سارے عالم میں صدائے بازگشت ہے اس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے چچا اور مربی تھے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے 8 سال کی عمر تک گنگوہ کی خانقاہ میں اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی سے پڑھیں اور بقیہ علوم و فنون اور حدیث کی کتابوں کی تکمیل مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے کیں، آپ کے دیگر اساتذہ کرام میں آپ کے چچا بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی اور حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ علوم باطنی کی تکمیل قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے حاصل کی۔ یہاں تک کہ آپ اپنے وقت کے ایک بڑے محدث اور علوم باطنی کے بڑے مرشد بن گئے۔

19 سال کی عمر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی درس و

تدریس میں مصروف ہوئے، 26 سال کی عمر میں بخاری شریف اور حدیث کی دیگر کتابوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی سلسلہ شروع فرمادیا۔ شیخ الحدیث کا لافانی لقب آپ کو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے عطا فرمایا تھا جو آپ کے نام کا قائم مقام بلکہ کتاب ”فضائل اعمال“ کی طرح آپ کی پہچان و شناخت بن گیا۔ آپ نے تقریباً 50 سال تک حدیث کی کتب پڑھائی ہیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے طویل عرصہ کے انہماک و مطالعہ سے جن کتابوں کو تصنیف و تالیف کیا ان میں سے ان کی انتہائی اہم کتاب ”اوز المسالک شرح موطا لامام مالک“ ہے یہ کتاب 6 جلدوں میں پوری دنیا میں دیگر کتب کی طرح مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ یہ کتاب بھی ان کے علمی و دینی تصنیفی کارناموں کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے علم و قلم میں ایسی برکت اور وسعت و دیعت عطا فرمائی تھی کہ لاکھوں بندگان کی دینی تربیت و ذہن سازی اور ان کے اخلاق و عقائد کی صحت و درستگی آپ کے علم و قلم کے ذریعہ ہوتی چلی گئی۔ وفات سے چند سال قبل ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے جہاں شاہ فیصل شہید نے آپ کو اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا اور سعودی عرب کی شہریت بھی دی۔

آپ نے مہاجر مدنی بن کر وہیں قیام کیا اور پوری دنیا سے آنے والے مسلمانوں کی رہنمائی فرماتے رہے۔ یہی عشق نبوت کا آفتاب و ماہتاب اپنی جلوہ افروزی دکھا کر 1982ء میں مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین میں ہمیشہ کیلئے لاکھوں مسلمانوں کو جنت کا راستہ دکھانے کے بعد غروب ہو گیا، مدینہ منورہ کے جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

بنوری نسبتوں کا امین

متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن

اُن پر کچھ لکھنے کے لیے میرا قلم ادب و عقیدت کے دَر سے الفاظ و احساسات کا کشکول بھر کے لایا تو تھا لیکن ان کی عظمت و شان کو دیکھ کر دلبرداشتہ سا ہو گیا کہ
 حٰہ کہاں میں اور کہاں یہ نکبت گل

افسردگی، قلب و جگر کے ساتھ ساتھ زبان و قلم پر بھی اپنے اثرات چھوڑ گئی
 بے کیف طبیعت سے جس بے ربط تحریر نے جنم لیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مفتی احمد الرحمان رحمہ اللہ کی علمی، عملی، روحانی اور وجدانی زندگی اپنے عہد کی سربستہ تاریخ کو دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ان کی حیات مستعار کا ہر گوشہ خاموش واعظ ہے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے کس کس پہلو کا تذکرہ کیا جائے؟ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ علم سے گہری دوستی، عمل سے مضبوط رشتہ، سلوک و احسان سے چولی دامن کا ساتھ، ادب و شفقت کے خوگر، حلم و بردباری حسن سلوک اور خلق عظیم کے پیکر تھے۔ کڑے حالات میں دین حق پر استقامت، برے وقت میں شرافت و متانت، دیانت و امانت اور جھوٹ کے ماحول میں حق و صداقت کے علمبردار تھے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ اس کو ”مکتب کی کرامت“ لکھوں یا ”فیضانِ نظر“ سمجھوں؟ آپ نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ خانوادہ ولایت کہلاتا ہے۔ آپ کے والد مولانا عبدالرحمان کیمیل پوری رحمہ اللہ بزمِ اشرف کے روشن چراغ تھے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے آپ کے والد کو ”کیمیل پوری“ کے بجائے ”کامل پوری“ کا لقب عنایت فرمایا۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ

نے اپنی چشم بصیرت سے ان میں خداداد صلاحیتوں کا مشاہدہ فرمایا تو بطور خاص ان کو اپنی تربیت میں لے لیا تاکہ اس گوہر نایاب کو مزید نکھار کر دین کی خدمت میں لگادیا جائے۔ مفتی احمد الرحمان رحمہ اللہ کے قلب سلیم میں جب حضرت بنوری رحمہ اللہ کی روحانی قوتوں نے حلول کیا تو سونے پہ سہاگہ کا منظر پیدا ہو گیا۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے آپ کو خلعت خلافت سے سرفراز بھی فرمایا اور علم و فضل کے اس بے تاج بادشاہ کو اپنی لخت جگر کا سر تاج بھی بنایا۔ خونی رشتوں کے تقدس کو سمجھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ سسر داماد میں باپ بیٹے کا پیار ہوتا ہے۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے اپنی زندگی میں آپ کو جامعہ علوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے شعبہ تعلیمات کے انتظامی امور کا مسؤول مقرر کیا۔ حضرت بنوری کی وفات کے بعد شوریٰ نے آپ کو منصب اہتمام کے لیے چنا اس میدان میں بھی آپ نے خوب محنت اور امانت و دیانت کا مظاہرہ کیا۔ جامعہ کے معاملات کو حساب و احتساب کی پٹری پر چلایا۔ آپ کے دور اہتمام میں آپ کی محنت سے جامعہ کی کئی شاخیں وجود میں آئیں۔

میں اپنی زندگی میں جن شخصیات کے علم و فضل اور جوانمردی سے متاثر ہوا وہ بہت کم ہیں، انہی میں ایک سنہرانا مفتی احمد الرحمان کا بھی ہے۔ پہلی بار ملاقات ہوئی: اونچا قد، کشادہ پیشانی، وجاہت و جلالت سے پر رونق چہرہ، بارعب صورت، نرم گفتار، شیریں لب و لہجہ، سادہ وضع قطع، حساس و نازک مزاج، غیور طبیعت، دل موہ لینے والی پر تاثیر زبان، انس و محبت سے لبریز دل اور عمدہ خیالات کے حامل ذہن کے مالک تھے۔ آپ کا کلام عالمانہ، ڈانٹ مشفقانہ اور انداز کریمانہ تھا۔

میری طالب علمانہ زندگی طفولیت سے جوانی کا سفر طے کر رہی تھی۔ جس سال میں درجہ ثالثہ میں تھا اس سال کی بات ہے کہ محرم کے دنوں میں روافض کا ٹولہ بنوری

ٹاؤن کے سامنے سے جلوس نکالنے کے لیے آیا۔ اول مفتی احمد الرحمان مرحوم نے جامعہ کے طلبہ کو سختی سے باہر نہ نکلنے کا پابند کیا پھر بنفس نفیس خود روڈ پر آئے اور فرمانے لگے کہ ہم یہاں سے جلوس نہیں نکلنے دیں گے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ راستے سے ہٹ جائیں ورنہ گولی مار دیں گے۔ حضرت نے شیر کی طرح گرج کر کہا کہ گولی مارنی ہے تو مارو لیکن جلوس کو کسی قیمت یہاں نے نہیں نکلنے دوں گا۔ چنانچہ اس حق گوئی اور جرات ایمانی کی پاداش میں حضرت کو گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت کی صحبت کی برکت سے اگرچہ میں کسی بھی تحریک کا باضابطہ کارکن نہیں تھا لیکن میرا تحریکی مزاج ضرور تھا۔ گرفتاری کے دوسرے دن میں حضرت سے ملنے کے لیے جیل میں بھی گیا۔ آپ کی زندگی جُہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے فریضے کو آپ نے صرف ادا ہی نہیں کیا بلکہ ادا کرنے کا حق ادا کر دیا۔ درس و تدریس، فتویٰ نویسی، وعظ و تلقین، ذکر و شغل، بیعت و ارشاد اور جرات مندانہ سماجی و سیاسی کاوشیں ان کی زندگی کے تابندہ ابواب ہیں۔

21 جنوری 1991ء پیر کے روز قسم اجل کی ہتھیلی پر ہزاروں بے قرار و بے کار روحیں مرغِ بھل کی مانند تڑپ رہی تھیں جبکہ چند ارواحِ راضیہ مرضیہ کا توشہ اور لاخوف علیہم ولا ہم یحزنون کا پروانہ لیے عازم سفر ہوا چاہتی تھیں، انہی میں حضرت مفتی احمد الرحمان رحمہ اللہ کی روح زبان حال سے فزت ورب الکعبۃ کا نعرہ مستانہ لگا کر فلک کا سینہ چاک کر گئی۔ ان اللہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیئی عندہ باجل مسمی۔۔

حضرت بنوری کی علمی آماجگاہ، روحانی فیض گاہ اور فکری تربیت گاہ کے پہلو میں جا کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قبریں جاگ رہی ہیں اور مسافر سو رہے ہیں۔

عربی خطبہ جمعہ مقامی زبان میں... علمی و تحقیقی تجزیہ

ساتویں وجہ:

اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ خطیب کے لیے تمام زبانوں کا ماہر ہونا شرط ہو، حالانکہ یہ شرط درست نہیں:

بسا اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ کسی علاقے میں خطبہ جمعہ کو سننے والے حضرات کئی زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً مسجد حرام اور مسجد نبوی میں جمعہ کی نماز پڑھنے والے حضرات مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی زبانیں بھی مختلف ہوتی ہیں، وہ بچارے چند دن کے لیے عمرہ یا حج کی غرض سے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔

اور اس کے علاوہ تقریباً تمام عرب ممالک میں لوگ کام کاج کی غرض سے دوسرے غیر عربی ممالک سے آتے ہیں ان کو بھی کافی عرصہ تک عربی زبان سے واقفیت نہیں ہوتی، اب عرب ممالک کے خطیب حضرات خطبہ جمعہ کے ترجمہ کی کیا صورت ہوگی؟ وہ کس کس مخاطب کے لحاظ سے ترجمہ کریں گے؟

اگر یہ کہا جائے کہ سب سامعین کی زبان میں ترجمہ ہونا چاہیے اول تو یہ ممکن اس لیے نہیں کہ اس سے لازم آئے گا کہ خطیب کے لیے تمام عجمی زبانوں سے واقف ہونا شرط ہو، حالانکہ اسلاف نے آج تک خطیب کے لیے یہ شرط عائد نہیں کی کہ وہ تمام عجمی زبانوں سے واقف ہو؟

لہذا یہ شرط لگانا باطل ہے، اور اگر کہو کہ خطیب کے لیے سب زبانوں کا ماہر

ہونا شرط نہیں تو پھر دوسری زبانوں والوں کی کیا رعایت ہوئی؟
بالفرض اگر یہ شرط درست بھی ہو اور کوئی خطیب ایسا بھی ہو جو تمام زبانوں سے واقف ہو تو جب وہ سامعین کی سب زبانوں میں ترجمہ کرنے بیٹھے گا تو اس کے لیے لمبا وقت درکار ہوگا، نتیجہ یہ کہ خطبہ جمعہ کے ترجمے کرتے کرتے یہی جمعہ کا وقت ختم ہو جائے گا اور اگر وقت نہ بھی ختم ہو تو پھر بھی خطبہ نماز سے لمبا ہو جائے گا جو کہ خود ایک خلاف سنت فعل ہے؟ لہذا ضروری ہے کہ خطبہ جمعہ عربی زبان میں ہی ہو۔

آٹھویں وجہ:

خطبہ جمعہ کے ترجمہ کے ناجائز ہونے کی آٹھویں وجہ یہ ہے کہ خطبہ جمعہ بعض باتوں میں نماز کے مشابہ ہے مثلاً:

- 1: سورۃ جمعہ کی آیت نمبر 9 فاسعوا الی ذکر اللہ سے مراد جمعہ کا خطبہ اور نماز دونوں ہیں جیسا کہ مفسرین کی عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہیں تو جب ذکر کی ایک قسم نماز کا ترجمہ نماز میں نہیں ہو سکتا تو ذکر کی دوسری قسم خطبہ کا ترجمہ کیسے ہو سکے گا؟
- 2: نماز میں ثناء ہے تو خطبہ میں بھی ثناء موجود ہے۔
- 3: نماز میں درود شریف ہے تو خطبہ میں بھی درود موجود ہے۔
- 4: نماز میں قرآن کریم کی قرات ہے تو خطبہ میں بھی قرات موجود ہے۔
- 5: نماز اگر بلا وجہ بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں تو خطبہ بھی بیٹھ کر دینا درست نہیں۔
- 6: نماز میں قرآن کریم کی قرات کو اگر توجہ سے سننے کا حکم ہے تو خطبہ جمعہ کو بھی توجہ سے سننے کا حکم ہے، اس میں کسی قسم کی گفتگو جائز نہیں، چنانچہ روایات میں آتا ہے:

1: عَنْ ابْنِ شَهَابٍ قَالَ أَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ أَخْبَرَهُ

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ
أَنْصِتْ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ.

(صحیح بخاری باب الانصات یوم الجمعة والامام یخطب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن جب امام کے خطبہ دے رہا ہو اس وقت اگر تو نے
اپنے ساتھی کو کہا چپ ہو جا! تو تو نے فضول کام کیا۔

2: عَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ
تَبَارَكَ وَهُوَ قَائِمٌ فَذَكَرَ بِأَيَّامِ اللَّهِ وَأَبُو الدَّرْدَاءِ أَوْ أَبُو ذَرٍّ يُعْزِرُنِي فَقَالَ مَتَى
أُنْزِلَتْ هَذِهِ السُّورَةُ إِنِّي لَمْ أَسْمَعْهَا إِلَّا الْآنَ فَأَشَارَ إِلَيْهِ أَنْ اسْكُتْ فَلَمَّا
انْصَرَفُوا قَالَ سَأَلْتُكَ مَتَى أُنْزِلَتْ هَذِهِ السُّورَةُ فَلَمْ تُخْبِرْنِي فَقَالَ أَبِي لَيْسَ لَكَ
مِنْ صَلَاتِكَ الْيَوْمَ إِلَّا مَا لَغَوْتَ فَذَهَبَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ وَأَخْبَرَهُ بِالَّذِي قَالَ أَبِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
صَدَقَ أَبِي.

(سنن ابن ماجہ باب ماجاء فی الاستماع للخطبة والانصات لہا)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے جمعہ کے دن سورۃ تبارک پڑھی اس حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کھڑے تھے، سونبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اللہ کے ایام یاد دلائے اور حضرت ابو
الدرداء یا حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے مجھے کچھ مکارا اور کہا کہ یہ سورت کب اتری
تھی میں نے اس سے پہلے اس کو نہیں سنا اور انہوں نے ان کو چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر
جب لوگ چلے گئے۔

انہوں نے کہا میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ یہ سورت کب اتری لیکن آپ

نے مجھے نہ بتایا اس پر حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں آج جمعے سے بجز تمہاری فضول کام کے کچھ حاصل نہ ہوا پھر وہ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور اس سارے واقعے کو حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی بات سمیت بیان کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابی نے سچ کہا۔

3: عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَهُوَ كَالْحَبَّارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا، وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ أَنْصِتْ لَيْسَتْ لَهُ جُمُعَةٌ.

(المصنف ابن ابی شیبہ فی الکلام اذا صعد الامام المنبر وخطب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے جمعہ کے دن امام کے خطبہ دیتے وقت بات کی وہ اس گدھے کی مانند ہے کہ جس پر کتابوں کا بوجھ لاداہوا ہو۔ اور جس نے اس کو خاموش ہونے کے لیے کہا اس کا جمعہ نہیں۔

4: عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَأَمَرْتُ أَصْحَابِي أَنْ يَرْتَحِلُوا، ثُمَّ أَتَيْتُ الْمَسْجِدَ، فَجَلَسْتُ قَرِيبًا مِنْ ابْنِ عُمَرَ، فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِي، فَجَعَلَ يُحَدِّثُنِي وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَعَلْنَا كَذَا وَكَذَا، فَلَمَّا أَكْثَرَ قُلْتُ لَهُ: أَسْكُتْ، فَلَمَّا قَضَيْنَا الصَّلَاةَ ذَكَرْتُ ذَلِكَ لِابْنِ عُمَرَ، فَقَالَ: أَمَّا أَنْتَ فَلَا جُمُعَةَ لَكَ، وَأَمَّا صَاحِبُكَ فَيُحْمَرُّ.

(المصنف ابن ابی شیبہ ج 2 ص 34)

حضرت علقمہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں ہم جمعہ کے دن مدینہ آئے، اور میں نے اپنے ساتھیوں کو سواریوں سے اتر کر آنے کا حکم دیا پھر خود مسجد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قریب آکر بیٹھ گیا، پھر میرے ساتھیوں

میں سے ایک آدمی آیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا اور امام اس وقت خطبہ دے رہا تھا، سو ہم نے ایسے ایسے کہا پھر جب آواز باتوں کی وجہ سے بہت ہو گئی تو میں نے اس کو کہا چپ ہو جاؤ، اور جب ہم نماز پوری کر چکے تو میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس اس کا تذکرہ کیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کے جواب میں فرمایا: تیرا تو جمعہ نہیں ہوا، اور رہا تیرا ساتھی تو وہ گدھا ہے۔

5: عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ سَعْدُ لِرَجُلٍ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: لَا صَلَاةَ لَكَ، قَالَ: فَذَكَرَ ذَلِكَ الرَّجُلُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ سَعْدًا قَالَ: لَا صَلَاةَ لَكَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لِمَ يَا سَعْدُ؟ قَالَ: إِنَّهُ تَكَلَّمَ وَأَنْتَ تَخْطُبُ، فَقَالَ: صَدَقَ سَعْدٌ.

(المصنف ابن ابی شیبہ ج 2 ص 34)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن ایک آدمی سے کہا تیری نماز نہیں ہوئی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس آدمی نے اس بات کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کے پاس کیا اور کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سعد کہتے ہیں کہ تیری نماز نہیں ہوئی۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد سے پوچھا کہ اس کی نماز کیوں نہ ہوئی؟ اس پر حضرت سعد نے فرمایا: کہ یہ آپ کے خطبہ کے دوران باتیں کر رہا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: سعد نے سچ کہا۔

6: عَنْ عَطَاءِ الْخِرْسَانِيِّ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَالَ صَهْ فَقَدْ لَغَا وَإِذَا لَغَا فَقَدْ قَطَعَ جَمْعَتَهُ. (المصنف عبد الرزاق باب ما يقطع الجمعة)

حضرت عطاء خراسانی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جب اس نے کسی کو کہا: چپ ہو جاؤ تو اس نے فضول کام کیا اور جس نے فضول کام کیا اس کا جمعہ ختم ہو جاتا ہے۔

7: عن علی رضی اللہ عنہ فی حدیث لہ قال من دنا من الامام فلغا ولم یسمع ولم ینصت کان علیہ کفل من الوزر ومن قال صہ فقد لغا ومن لغا فلا جمعة لہ ثم قال ہکذا سمعت نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم .

(رواہ احمد وابوداؤد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں ہے انہوں نے فرمایا: جو کوئی امام کے پاس بیٹھے پھر خاموشی سے خطبہ نہ سنے اور بے ہودہ بات کرے تو اس پر گناہ کا بوجھ ہے اور اگر کوئی کسی سے کہے خاموش ہو جاؤ تو اس نے بے ہودگی کی اور بے ہودگی کرنے والے کا جمعہ نہیں، میں نے تمہارے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے۔

(منتقى الاخبار للشيخ عبدالسلام ابن تيمية مترجم مطبوعہ دار الدعوة السلفية لاہور)

غور فرمائیں کہ خطبہ جمعہ کے دوران بات کرنے والے کو گدھا اور اس کو چپ کرانے والے کو کہا گیا اس کا جمعہ ہی نہ ہوگا، حالانکہ عام وعظ میں کوئی بات کرے یا دوسرا اس کو خاموش کرائے تو اس قدر سختی اور وعید کسی حدیث میں وارد نہیں ہوئی اس سے بھی ثابت ہوا کہ خطبہ جمعہ کو نماز کے ساتھ مشابہت ہے اور اس کی حیثیت محض وعظ ونصیحت کی نہیں ہے۔

7: خطبہ جمعہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے بعض حضرات نے اس کو دو رکعت کے قائم مقام قرار دیا ہے اور اس کے فوت ہونے کی وجہ سے چار رکعت پڑھنے کے موقف کو اختیار کیا ہے کچھ روایات ملاحظہ فرمائیں :

1: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّهُ قَالَ: إِنَّمَا جُعِلَتِ الْخُطْبَةُ مَكَانَ الرَّكْعَتَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يُدْرِكِ الْخُطْبَةَ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا. (المصنف ابن أبي شيبة الرجل تفوته الخطبة)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خطبہ دو رکعت کی جگہ رکھا گیا ہے جو کوئی خطبہ کو نہ پائے وہ چار رکعت پڑھے۔

2: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، قَالَ: كَانَتِ الْجُمُعَةُ أَرْبَعًا، فُجِعِلَتِ رَكْعَتَيْنِ مِنْ أَجْلِ الْخُطْبَةِ، فَمَنْ قَاتَنَتْهُ الْخُطْبَةُ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا. (المصنف ابن أبي شيبة ج 2 ص 37)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کی چار رکعت تھیں، اور دو رکعت خطبہ کی وجہ سے کم ہو گئیں سو جس کا خطبہ فوت ہو جائے تو وہ چار رکعت پڑھے۔

3: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: مَنْ أَدْرَكَ الْخُطْبَةَ فَالْجُمُعَةُ رَكْعَتَانِ، وَمَنْ لَمْ يُدْرِكْهَا فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا، وَمَنْ لَمْ يُدْرِكِ الرَّكْعَةَ فَلَا يَغْتَمِدُ بِالسَّجْدَةِ حَتَّى يُدْرِكَ الرَّكْعَةَ. (الطبرانی فی الکبیر کذا فی مجمع الزوائد ج 1 ص 218)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس نے خطبہ پالیا اس کے لیے جمعہ دو رکعتیں ہیں اور جس کو خطبہ نہ ملا وہ چار پڑھے اور جو نماز میں بعد میں شریک ہو وہ اس رکعت کو شمار نہ کرے جس میں وہ ملا ہے جب تک اسے اس رکعت کا رکوع نہ مل جائے۔

4: عَنْ عَطَاءٍ؛ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: إِذَا لَمْ يُدْرِكِ الْخُطْبَةَ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا. (المصنف ابن أبي شيبة ج 2 ص 36)

حضرت عطاء تابعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب جمعہ پڑھنے والا خطبہ نہ پائے تو چار رکعت پڑھے۔

5: عَنْ عَطَاءٍ، وَطَاوُوسٍ، وَجَاهِدٍ، قَالُوا: إِذَا قَاتَنَتْهُ الْخُطْبَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

(المصنف ابن ابی شیبہ ج 2 ص 36)

صَلَّى أَرْبَعًا.

حضرت عطاء، حضرت طاوس، اور حضرت مجاہد رحمہم اللہ نے فرمایا جب آدمی کا خطبہ جمعہ کے دن فوت ہو جائے تو وہ چار رکعت پڑھے۔

6: عَنْ مَكْحُولٍ، قَالَ: إِذَا فَاتَتْهُ الْخُطْبَةُ صَلَّى أَرْبَعًا. (ابنِ)

حضرت مکحول رحمہ اللہ نے فرمایا: جب اس کا خطبہ فوت ہو جائے تو وہ چار رکعت پڑھے۔

مذکورہ روایات سے ثابت ہوا کہ خطبہ جمعہ نماز جمعہ کے لیے شرط ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ واضح لفظوں میں فرما رہے ہیں کہ خطبہ جمعہ دو رکعت کے قائم مقام ہے اور دیگر حضرات نے بھی فرمایا کہ جس کو خطبہ جمعہ نہ ملے وہ چار رکعت پڑھے ان روایات کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس کو خطبہ پڑھنے والا امام نہ ملے یا امام نے خطبہ ہی نہ پڑھا ہو تو وہ چار رکعت پڑھے گویا خطبہ کو حقیقتاً حکماً پانا چار رکعت کی ادائیگی اور وجوب کا سبب ہے کیونکہ اگر امام نے خطبہ پالیا جیسے کسی نے امام کی قرات نہیں پائی مگر رکوع پالیا تو اس نے قرات پالی، اس بات کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے کہ جن میں آیا ہے کہ جس نے جمعہ کی ایک رکعت پالی تو اس نے جمعہ پالیا، ظاہر ہے کہ جس نے ایک رکعت نہیں پائی خطبہ تو اس نے بدرجہ اولیٰ نہیں پایا۔

لہذا ان روایات کا مطلب یہی ہوا کہ جس کو خطبہ پڑھنے والا امام نہ ملے یا وہ خطبہ نہ پڑھے تو جمعہ نہیں پڑھے گا بلکہ ظہر کی چار رکعت پڑھے گا۔

بہر کیف! ان روایات سے واضح الفاظ میں خطبہ جمعہ کی نماز کے ساتھ مشابہت معلوم ہوتی ہے۔ اور جب نماز کے دوران نماز کا غیر عربی میں ترجمہ درست نہیں ہے تو خطبہ جمعہ کا ترجمہ خطبہ کے دوران کیسے درست ہوگا؟ (..... جاری ہے)

لوحِ ایام

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ سرگودھا میں معزز مہمانان گرامی کی آمد اور متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ کے اندرون و بیرون ممالک کے مختلف مسکلی اسفار اہم مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیات سے خصوصی ملاقاتیں

❖ سرگودھا شہر کپڑے کی مارکیٹ میں اچانک آگ بھڑک اٹھی اور تاجر برادری کو اربوں روپوں کا نقصان ہوا۔ اس موقع پر متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن دامت برکاتہم اظہار افسوس کے لیے مارکیٹ تشریف لے گئے اور تاجر برادری کے لیے دعا بھی فرمائی۔

❖ 7 جنوری بروز جمعرات ماہانہ تین روزہ تحقیق المسائل کو رس منعقد ہوا۔ جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد شریک ہوئے۔

❖ 7 جنوری بروز جمعرات کو مرکز اہل السنۃ والجماعۃ میں ماہانہ اصلاحی و خانقاہی اجتماع ہوا۔ جس میں متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن نے بیان فرمایا اور چاروں سلاسل میں کثیر افراد کو بیعت بھی فرمایا۔

❖ ہانگ کانگ کے چیف امام مفتی محمد ارشد مرکز اہل السنۃ والجماعۃ میں تشریف لائے اور مرکز کے شعبہ جات کا وزٹ کیا۔ بعد ازاں متکلم اسلام اور دیگر عملہ مرکز کے ساتھ کافی بات چیت کی۔ انہوں نے کہا کہ اکابر کے منہج اور مسلک دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا بہت ضروری ہے۔

❖ 15 جنوری کو حضرت متکلم اسلام عمرہ کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے عمرہ کی ادائیگی کے ساتھ علماء سے ملاقاتیں بھی کیں

ماہنامہ فقیہ ملنے کے پتے

ایجنسی ہولڈرز	علاقہ	فون نمبرز
دارالایمان	کراچی	03342028787
ڈاکٹر تحسین اللہ	پشاور	03339217613
مولانا محمد نوید حنیف	آزاد کشمیر	03132317090
مولانا محمد شہباز	کبیر والا	03066310082
مولانا محمد صدیق	ڈیرہ غازی خان	03356351893
مولانا محمد قاسم	ملتان	03007408019
مولانا عمر خطاب	اٹک	03077375075
رحمت اللہ	کوہاٹ	03449251287
مولانا خالد زبیر	فیصل آباد	03153759031
مولانا خالد زبیر	چکوال	03335912502
محمد رئیس	ٹانک	03319143483
مولانا محمد دلاور	ادوکارہ	03136969193
مولانا عبد اللہ قمر	قصور	03008091899
مولانا عبد اللہ شہزاد	حافظ آباد	03212374824
عبد الوکیل عزیزی	سیالکوٹ	03338639255
ذوالقرنین حیدر	ڈیرہ اسماعیل خان	03343682508

نوٹ: ایجنسی بک کروانے کے لیے رابطہ کریں: 03326311808